جلد ۸۵ — مارچ ۱۹۷۶ء — عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

تفہیم القرآن

کے

نئے ایڈیشن

طبع ہوکر آگئے ہیں۔ قارئین کرام واجینٹ حضرات آج ہی اپنے آرڈر سے

مطلع فرمائیں

ہدیہ تفہیم القرآن	جلد اوّل	۳۸/- روپے
"	جلد دوم	۴۲/- "
"	جلد سوم	۴۵/- "
"	جلد ششم	۳۸/- "

ادارہ ترجمان القرآن۔ اچھرہ۔ لاہور

فون نمبر —— ۴۱۱۰۱۶ ، ۴۱۱۰۱۷

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۱	مارچ سنہ ۱۹۷۶ء مطابق ربیع الاول سنہ ۱۳۹۶ھ	جلد ۸۵

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فون نمبر: ۴۱۱۰۱۶ ——— ۴۱۱۰۱۷

زر سالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر معمولی عظمت اور رفعت کا احساس اور ان سے گہری محبت اور عقیدت کا جذبہ یوں تو ہر مسلمان کے دل میں ہر لمحہ موجود رہتا ہے لیکن ہر سال ربیع الاوّل کے آنے کے ساتھ ہی اس کے قلب و دماغ پر عجیب و غریب قسم کی کیفیات طاری ہونا شروع ہو جاتی ہیں ۔ اُسے اِس بات سے تو بے حد مسرت ہوتی ہے کہ اس ماہ ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے جن کے دم قدم سے نوعِ انسانی نے رشد و ہدایت کی ایک مستقل راہ پائی ، جن کی ذاتِ اقدس سے خیر و برکت کے سرمدی چشمے جاری ہوئے ، جن کی تعلیمات نے انسانیت کو صحیح بصیرت عطا کی ، جن کے فیضانِ نظر سے انسان کے اندر خیر اور بھلائی کو دنیا میں سربلند کرنے کی اُمنگ پیدا ہوئی اور نیکی کی قوت کو دنیا کی غالب قوت بنانے کا ولولہ پیدا ہوا ، مگر مسرت و شادمانی کی ان کیفیات کے ساتھ ایک مسلمان جب یہ سوچتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُمتِ مسلمہ پر جو ذمہ داریاں عاید کر کے دُنیا سے رخصت ہوئے تھے ان ذمہ داریوں کی بجا آوری میں اُمت سے کس قسم کی افسوسناک کوتاہی ہوئی ہے تو اس کی آنکھوں میں جھلکنے والے خوشی کے آنسو اشک ہائے ندامت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور وہ خیالات کے ہجوم میں کھو کر سوچنے لگتا ہے کہ حشر کے دن اپنے خالق و مالک کے دربار میں یہ اُمت کن کن کوتاہیوں بلکہ کس قسم کے سنگین گناہوں کے ساتھ پیش ہوگی اور وہاں اُسے اس حالت میں اُس کے آقا و مولا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دیکھ رہے ہوں گے اور حضورؐ اپنی اُمت کا یہ المناک منظر دیکھ کر کس قدر رنجیدہ خاطر ہو رہے ہوں گے ؟

یہ یا اسی نوعیت کے دوسرے خیالات ہر اُس شخص کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جو اُمتِ مسلمہ کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اپنی ملی ذمہ داریوں کو کچھ بھی پہچانتا ہے ۔ اس بنا پر ربیع الاوّل کی آمد اُس کے لیے جہاں مسرت کا پیغام لاتی ہے وہاں اس کے اندر خود احتسابی کا احساس پیدا کر کے اسے دل گرفتہ بھی کرتی ہے ۔

حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ انسانوں کی بہت بڑی اکثریت جسے ملتِ اسلامیہ کہا جاتا ہے سارے جھوٹے خداؤں کی خدائی کا انکار کر کے خدائے واحد کی بندگی اختیار کر چکی تھی - اس نے اپنے ہادیِ برحق کی قیادت میں رنگ، نسل، وطن کے تمام بُت اپنے ہاتھوں سے توڑ کر حق و صداقت، خدا ترسی اور شرافت کی بنیاد پر نوعِ بشری کی از سرِ نو شیرازہ بندی کی تھی - اس کی اس شیرازہ بندی کے نتیجہ میں جو نیا معاشرہ معرضِ وجود میں آیا تھا وہ انسان اور انسان کے مابین ہر قسم کے مصنوعی امتیازات سے پاک تھا - اس میں کسی فرد کا مرتبہ و مقام صرف اِس ایک معیار پر متعین کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے خالق و مالک کا کس حد تک مطیع اور اپنے ہادی کا کس قدر متبع ہے - اس ایک معیار کے علاوہ معاشرے میں تفوّق اور برتری کا کوئی دوسرا معیار نہ تھا - پھر یہ معاشرہ ہر قسم کے سیاسی استبداد اور معاشی استحصال سے پاک تھا - ہر فرد کو چند انسانی بنیادی حقوق حاصل تھے جو اس کی ذات کے لیے حصار کا کام دیتے تھے اور جن سے کوئی فرد بھی بغیر معقول وجہ تعرض نہ کر سکتا تھا - پھر معاشرت ہر بُرائی سے پاک اور منزّہ تھی اور اس طرح ایک انسان ذہنی آسودگی، قلبی سکون اور معاشرتی تحفظ کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا - خدا سے تعلقِ خاطر نے جہاں اس کے دل کی دنیا منور کر رکھی تھی وہاں اس کی معاشرتی، سیاسی اور معاشی زندگی کو بھی تعلیماتِ الٰہی نے خیر اور بھلائی سے معمور کر رکھا تھا - مختلف قومیں اور نسلیں اپنے آبائی دین چھوڑ کر اسلام کی طرف کھنچی چلی آ رہی تھیں۔ الغرض مسلم معاشرہ خدا کی بادشاہت کا ہر لحاظ سے ایک مکمل نمونہ پیش کر رہا تھا -

---

ایک انسان کا تصور اس وقت کانپ اُٹھتا ہے جب وہ یہ سوچتا ہے کہ اس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور غلامی کا دم بھرنے کے باوجود اُن کی اس مقدس امانت کا، جو انہوں نے اپنی ارفع و اعلےٰ تعلیمات اور پاکیزہ سوسائٹی کی صورت میں اُس کے سپرد کی، کیا حشر کیا ہے - حضورؐ نے ہمیں جھوٹے خداؤں کی غلامی سے آزاد کر کے خالقِ کائنات کی غلامی اختیار کرنے کی تلقین کی تھی اور عملاً اس غلامی کی بنیاد پر ایک معاشرہ تعمیر کر کے ہمیں یہ بتایا تھا کہ جب کوئی قوم بندگیٔ رب کی اساس پر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ڈھانچہ اُٹھاتی ہے تو اُسے اِس قسم کے روحانی اور اخلاقی فیوض اور معاشی اور سیاسی برکات حاصل ہوتی ہیں لیکن ہم نے حضورؐ کی اِس امانت کے ساتھ بڑا شرمناک رویہ اختیار کیا - ہم لات و منات کی پرستش پر تو بلا شبہ مائل نہ ہوئے مگر ان بُتوں کی جگہ بہت سے دوسرے نئے بُت تراش کر اُن کی محبت میں گرفتار ہو گئے - ہمارے بعض بھائی بندِ وطنیت کے

بُت کے پجاری بنے، بعض نے فراعنہ کے ساتھ اپنا نسبی تعلق جوڑ کر اس پر اِترانا شروع کیا، بعض نے خلافت کی قبا چاک کر کے اُمتِ مسلمہ کی وحدت کو پارہ پارہ کیا اور پھر رنگ، نسل، وطن اور زبان کی بنیاد پر اُسے چھوٹے چھوٹے دھڑوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی، بعض نے دینی شعور کو جلا دینے کے بجائے ملّتِ اسلامیہ میں طبقاتی نفرت و حقارت کی آگ بھڑکائی۔ ان ساری مذموم کارروائیوں کے بھیانک نتائج اس صورت میں ہمارے سامنے آئے ہیں کہ اُمتِ مسلمہ کی عظیم اکثریت دعوئ ایمان کے باوجود ایمان کے حقیقی جوہر سے کافی حد تک محروم ہو گئی ہے۔ اس کے بہت سے افراد زبان کی حد تک تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے دعویدار ہیں مگر ان کا دلی لگاؤ کافرانہ نظاموں اور ان کے اسلام دشمن علمبرداروں سے ہے۔ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے اعدائے اسلام سے رہنمائی حاصل کر رہے ہیں اور اپنی زندگی کے اصل مقصد یعنی فریضۂ اقامتِ دین کو یکسر فراموش کر کے ملحدانہ نظریات کو پھیلانے اور کافرانہ نظامِ زندگی برپا کرنے میں منہمک نظر آتے ہیں۔ کیا یہ اندوہناک صورتِ حال مسلمانوں کے دعوئ ایمان کی کھلے طور پر تکذیب نہیں کر رہی؟ کیا مسلم قوم کی اس منافقانہ روش کو دیکھ کر کوئی شخص یہ باور کر سکتا ہے کہ یہ قوم اس دین کو دُنیوی اور اُخروی سعادت کا فی الحقیقت واحد ذریعہ سمجھتی ہے جو ہادئ برحق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اُسے خداوند تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا ہے؟

ایمان اور محبت اور ان کے دعوے محض الفاظ کی بازی گری نہیں۔ یہ الفاظ اپنے اندر گہری معنویت اور ہر دعوے اپنے بعض ناگزیر تقاضے بھی رکھتے ہیں۔ ایک آدمی جب یہ کہتا ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاتا ہوں اور ان کی محبت کو اپنی زندگی کا بیش قیمت سرمایہ سمجھتا ہوں تو پھر اس ایمان اور محبت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ غیر اللہ سے اپنا تعلق توڑ کر صرف اللہ رب العزت سے اپنا رشتۂ عبودیت استوار کرے اور ہر دوسرے رہنما کو چھوڑ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ رحمت سے اپنے آپ کو وابستہ کر کے اس یقینِ محکم کے ساتھ میدانِ عمل میں اُترے کہ ہر ایسا نظریہ یا فعل یا نظامِ فکر و عمل جس کی صحت کی تصدیق اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات سے نہیں ہوتی وہ سراسر باطل اور تباہ کن ہے اور ہر وہ بات صحیح اور برحق اور نوع البشری کے لیے دُنیا اور آخرت میں خیر اور بھلائی کی موجب ہے جو اُسے خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے حاصل ہوئی ہے۔ ایمان کا دعویدار جب تک اللہ وحدہٗ لاشریک کے رب ہونے پر

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واحد سرچشمۂ ہدایت ہونے پر اور اسلام کے واحد صحیح نظامِ حیات ہونے پر غیر متزلزل یقین پیدا نہیں کرتا اُس وقت تک اُس کا دعویٰ ایمان پورا نہیں ہوتا۔ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی محبت انسان پر بعض ذمہ داریاں عاید کرتی ہے جن میں پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ جو شخص اللہ اور اُس کے رسولؐ کے ساتھ اپنی وابستگی کا دعویٰ کرتا ہے وہ سب سے پہلے اپنے آپ کو اُن ساری وابستگیوں سے الگ کرے جو اس کے دین کی راہ میں حائل ہوں۔ آپ اسلام کی اوّلین اساس کلمہ کو دیکھیں کہ اس میں اثبات سے پہلے نفی اور اقرار سے پہلے انکار موجود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک ایک انسان خدا کے علاوہ ہر دوسرے معبود کا انکار نہیں کرتا اُس وقت تک معبودِ حقیقی کا اقرار بالکل بے وزن ہوتا ہے۔ جس طرح دن رات یکجا نہیں ہو سکتے بالکل اسی طرح اسلام اور غیر اسلام ایک دل میں نہیں سما سکتے۔ اگر کوئی شخص خدا اور اُس کے رسولؐ کا مطیع ہے تو پھر وہ ہر اُس مطاع کا باغی ہے جو اُس سے بندگیٔ رب کے علاوہ کسی اور چیز کا مطالبہ کرتا ہے۔ اسے اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے محبت اور عقیدت ہے تو پھر وہ ہر اس چیز سے دستبردار ہونے کی گہری تڑپ اور آرزو رکھتا ہے جو اس شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنے سے اُسے روک سکتی ہے۔ ایمان غیر سنجیدہ لوگوں کا کوئی بیکار مشغلہ نہیں۔ یہ مختلف وارداتِ قلبی میں سے محض ایک سیماب آسا روحانی کیف بھی نہیں جس سے انسان وقتی طور پر کچھ سرور و مستی حاصل کر سکے۔ ایمان زندگی کا سب سے پختہ عہد، غیر متزلزل یقین اور مقصدِ حیات کے بارے میں انسان کا دو ٹوک فیصلہ ہے جس میں یہ عزمِ صمیم بھی شامل ہے کہ صاحبِ ایمان ہر اُس چیز کو جلا کر خاکستر کر دے گا جو ایمان کی راہ میں رکاوٹ بنے گی۔ ایمان بلاشبہ روحانی کیف کے حصول کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے لیکن اسلام جس روحانی سرور سے انسان کو لذت آشنا کرتا ہے وہ وجد و حال کی محفلوں سے نہیں بلکہ حق و باطل کی جنگاہ میں اپنی ہر چیز جھونک دینے سے حاصل ہوتا ہے۔

ایمان کی مستی وقتی اور عارضی نہیں ہوتی بلکہ مستقل اور دائمی ہوتی ہے۔ ایمان کا نشہ وہ نشہ نہیں جسے دنیا کی کوئی تلخی اُتار دے بلکہ صاحبِ ایمان کی زندگی میں جس تناسب سے تلخیاں بڑھتی ہیں اُسی نسبت سے وہ نشۂ ایمان میں زیادہ سرشار ہو کر خدا اور رسولؐ کی راہ میں زیادہ فدائیت اور جاں نثاری کا مظاہرہ کرتا ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر آج اچانک دنیا میں تشریف لے آئیں تو کیا انہیں یہ دیکھ کر سخت دکھ نہ ہوگا کہ اُن کی محبت کے گیت گانے والوں اور اُن کی یاد میں محفلیں منعقد کرنے والوں نے جگہ جگہ اپنے مفادات

کے صنم کدے سے آباد کر رکھے ہیں اور اُن کا ایمان جو کبھی باطل کے لیے چنگاری کی حیثیت رکھتا تھا اب راکھ کا بے جان تودہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان ایمان کے اس تودے کے سایے میں بڑی بے تکلفی کے ساتھ کفر و الحاد کو بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کر رہے ہیں اور کافرانہ نظامہائے حیات کے اندر جب بھی توسیع کا جنون پیدا ہوتا ہے تو وہ بغیر کسی مزاحمت کے ایمان کے اس تودے کو ہٹا کر اپنا تسلط قائم کر لیتے ہیں اور مسلمان اس پسپائی کو ہنسی خوشی گوارا کرتے چلے جاتے ہیں۔

جس طرح روح سے عاری جسم اپنے اندر مدافعت کی کوئی قوت نہیں رکھتا اور وہ دوسروں کے ہاتھ میں بالکل بے بس ہوتا ہے بالکل اسی طرح وہ ایمان جس کے پیچھے باطل کو مٹانے کا شدید جذبہ موجود نہ ہو وہ بالکل بے جان لاشہ ہے جسے باطل کی قوتیں جس طرح چاہتی ہیں روندھتی چلی جاتی ہیں۔ ایمان تو کسی نہ کسی شکل میں عربوں کے اندر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی موجود تھا لیکن یہ ایسا بے جان ایمان تھا جو کفر کے ہر مطالبے کے سامنے سرنگوں ہونے پر تیار رہتا۔ حضورؐ جب دنیا میں تشریف لائے تو انہوں نے ایمان کو باطل کی ہر آمیزش سے پاک کر کے اُسے نہ صرف اُس کی فطری تابندگی بخشی بلکہ ایسی قوت و توانائی بھی عطا کی جس سے کفر کو ایمان کے ہاتھوں ہر میدان میں عبرت ناک شکست اُٹھانا پڑی۔ اس نئے ایمان نے مسلمانوں کو نئے حوصلے اور تازہ ولولے دیے۔ انہیں نئے عزائم سے لیس کر کے نئی تدابیر اور نئے انداز کے ساتھ میدانِ عمل میں آتارا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایمان کے یہ نئے علمبردار جنہیں چند سال پیشتر گلہ بانی کے علاوہ اور کوئی کام نہ آتا تھا وہ جہانبانی کے فن میں پوری دنیا پر سبقت لے گئے۔ دوسری قوموں نے ان "بے نواؤں" کی تقلید میں اپنے فکر و نظر کے زاویے بدلے، اپنی جدوجہد کے نئے رُخ متعین کیے، اپنی معاشرت اور معیشت کے ڈھانچوں کو تبدیل کیا، اپنے نظامِ حکومت کی اصلاح کی، اپنی تہذیبی اور اخلاقی اقدار کو اسلامی اقدار سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ اِن "گڈریوں کا" پاکیزہ ذوق، تمدن اور شائستگی کا سب سے اعلیٰ معیار قرار پایا۔ الغرض یہ تاریک خیال اور علم و ہنر سے بے بہرہ "صحرا نشین" پوری انسانیت کے رہنما بن کر دنیا کے افق پر بڑی سُرعت کے ساتھ اُبھرے اور ایسے انقلاب انگیز کارنامے سرانجام دیے جو نہ صرف رہتی دنیا تک نوعِ بشری کے حافظہ میں نہایت خوشگوار یادوں کے طور پر محفوظ رہیں گے بلکہ انسانیت کے مختلف کاروان جب بھی جادۂ مستقیم سے بھٹک کر باطل خیالات و افکار کے تپتے ہوئے ریگزاروں میں دم

توڑنے لگیں گے تو اس وقت وہ ان مقدس ہستیوں کے اِن مقدس کارناموں ہی سے نئی زندگی حاصل کریں گے۔ اِن کارناموں کی حیثیت زیبِ داستان کی نہیں بلکہ روشن چراغوں کی سی ہے جن کی مدد سے انسانیت کے گم کردہ راہ قافلے راہ یاب ہو کر منزلِ مقصود تک پہنچتے ہیں۔ آپ اگر تاریخ کا بغور مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ انسانیت جب بھی فوز و فلاح کا اصل راستہ چھوڑ کر تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارنا شروع کرتی ہے اور کامیابی کی کوئی راہ نہ پا کر مایوسی کی چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے اپنی زندگی کے خاتمہ کا تہیہ کرتی ہے تو یاس و قنوطیت کے ان روح فرسا لمحات میں اگر کوئی داعیہ اسے زندہ رہنے کا حوصلہ دیتا ہے تو وہ اللہ پر ایمان اور اس ایمان سے متعلق میں پاکیزہ زندگی اور پاکیزہ معاشرت کا وہ حیات آفریں تصور ہی ہے جس کی عملی تعبیر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جان نثاروں کی مقدس زندگیوں میں بآسانی دیکھی جا سکتی ہے۔

دورِ حاضر کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ دنیا میں ایمان کے دعویدار تو موجود ہیں مگر انسانی معاشرہ ایمان کے ثمرات سے یکسر محروم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایمان ایک قلبی کیفیت کا نام ہے جسے دیکھا نہیں جا سکتا لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ یہ "قلبی کیفیت" مٹی کے نیچے دبے ہوئے بیج کی طرح نیک اعمال کی صورت میں بارآور ہوتی ہے اور اگر ایمان کے بیج سے خیر اور بھلائی کی کونپلیں نہیں پھوٹتیں، اور یہ کونپلیں پاکیزہ معاشرہ کی صورت میں تناور درخت بن کر دکھی انسانیت کو آرام اور سکون سے ہمکنار نہیں کرتیں تو پھر ایمان کا یہ بیج وہ بیج نہیں ہو سکتا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے جلیل القدر صحابہؓ نے انسانوں کے دل و دماغ میں بویا تھا۔ ایمان کے سایے میں کفر کا جھاڑ جھنکار کس طرح موجود رہ سکتا ہے؟ اسی طرح کفر کی اکاس بیل کے نیچے ایمان کا درخت کس اصول کی بنا پر برگ و بار لا سکتا ہے؟ یہ عہدِ حاضر کے المیوں میں سے ایک المیہ ہے کہ مسلم معاشرے کے اندر ایمان اور کفر ایک دوسرے کے ہمرکاب نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے بعض فریب خوردہ مسلمان اس صورتِ حال سے مطمئن ہوں کہ ایمان اور کفر کی اِس یکجائی سے انہیں دنیوی لذات اور اخروی فوائد سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا نسخہ ہاتھ لگ گیا ہے لیکن جو لوگ ایمان، اس کے مزاج اور اُس کے مقتضیات کا کچھ بھی علم رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایمان اور کفر کی یہ آمیزش دنیا و آخرت دونوں کی بربادی ہے۔ وہ ایمان جو کفر کے ساتھ مفاہمت کرنے پر آمادہ ہو اس کا حال اُس نمک کا سا ہے جو اپنی نمکینی کھو چکا ہو، اس لیے لوگ جلد ہی اسے ایک بیکار بلکہ مضر شے سمجھ کر بوسیدہ افکار کے کوڑا کرکٹ میں پھینک دیتے ہیں اسی طرح وہ کفر جو ایمان کو گوارا کرنے

لگے اس کی قوت مسلوب ہو جاتی ہے اور اُس کے ماننے والے کسی مخصوص نظریہ کے علمبردار کی حیثیت سے دنیا میں سربلند نہیں ہوسکتے بلکہ ہر اُبھرتی ہوئی طاقت کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اپنے دُنیوی مفادات کے تحفظ کے لیے مختلف چالیں چلتے رہتے ہیں۔ ان کی ایمان کے ساتھ یہ سازگاری انہیں اخلاقی اعتبار سے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی اور نہ کفر کے ساتھ استواری انہیں کسی نظریہ کا خادم بناتی ہے۔ انہیں ہمیشہ ایک ہی بات کی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ اُن کے مفادات پر کوئی زد نہ پڑنے پائے۔ ایسے لوگ اس دھرتی پہ ایک نار وا بوجھ ہوتے ہیں اور جب اس کرۂ ارضی پہ ان کی کثرت ہو جاتی ہے تو پھر اسلام اور کفر کی آویزش اور حق و باطل کی کشمکش کی جگہ مفادات کی چھینا جھپٹی شروع ہوتی ہے اور مختلف گروہ ایک دوسرے کے خلاف بڑے مکروہ اور ذلیل ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں اور انسانیت عزّ و شرف کی قبا خود اپنے ہاتھوں سے تار تار کر دیتی ہے۔

ذرا سوچیے کہ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب یہ بات آتی ہوگی کہ اُن کی اُمت کے افراد دُنیا سے فسق و فجور مٹانے کے بجائے فسق و فجور پھیلانے میں منہمک ہیں، منکرات کا استیصال کرنے کے بجائے معروف کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ ان کی عقیدت و محبت کے دعویدار نہ صرف خود سُودی کاروبار میں ملوّث ہیں بلکہ اسے بڑھانے اور ترقی دینے کے درپے ہیں۔ خداوند تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل کے چرچے تو ہیں لیکن اللہ کی عظمت اور اس کی توحید کا زبان سے بار بار اقرار کرنے والوں کے دلوں پہ باطل کی عظمت کا نقش ثبت ہے اور خدائے واحد کی پرستش کرنے والے جھوٹے خداؤں کی پرستش کے بھی قائل ہیں تو اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جس قدر کرب محسوس ہوتا ہوگا اس کے اظہار کی ایک مسلمان کس طرح تاب لا سکتا ہے؟ اللہ کے رسولؐ نے تو ہمیں اسلام کی دولت اس واضح فرمان کے ساتھ دی تھی کہ ہم اِس کے سچے دین کو سارے ادیان پہ غالب کر دیں اور پوری دُنیا پر اس کی عملداری قائم ہو لیکن ہم نے اس دین کو دُنیا کی سب سے غالب قوت بنانے کے بجائے چند بے جان رسومات کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کے طفیل اور اللہ کے دین کی برکت سے ہم دنیا میں سربلند ہوئے لیکن ہم اپنے ان عظیم محسنوں کے عظیم احسانات کا بدلہ اِس طرح چکا رہے ہیں کہ حضورؐ کی رسالت کی صبح و شام تصدیق کرنے کے باوجود حضورؐ کی پیروی سے منہ موڑتے چلے جاتے ہیں اور اللہ کے دین کو زندگی کے ہر گوشے میں اپنانے کے بجائے کفر و الحاد کو راہ پانے کے مواقع فراہم کر رہے ہیں۔ حضورؐ دنیا میں مبعوث ہوئے تو انسانیت کا مقام بلند ہوا، (باقی بر صفحہ ۴۸)

دعوتِ اسلامی کو روکنے کے لیے قریش کی تدبیریں

(۲)

۳۔ قریش کی چھچھوری اور ذلیل حرکات

حضورؐ کے خلاف قریش کے لوگ جو حرکات کر رہے تھے ان میں سے بعض نہایت ذلیل اور چھچھوری تھیں جن سے مقصود آپ کی دل شکنی کرنا اور آپ کو تنگ کرنا تھا۔

حضرت زینبؓ کو طلاق دلوانے کی کوشش ان میں سے ایک حرکت یہ تھی کہ قریش کے لوگوں نے حضورؐ کے داماد ابوالعاص بن الرَّبیع پر دباؤ ڈالا کہ وہ آپؐ کی بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو بھی اسی طرح طلاق دے دیں جس طرح ابو لہب نے اپنے بیٹوں سے آپؐ کی صاحبزادیوں حضرت رُقَیَّہؓ اور اُمِّ کلثومؓ کو طلاق دلوائی تھی۔ یہ ابوالعاص، بنی عبدالعزّٰی بن عبدِ شمس میں سے تھے، ان کی ماں ہالہ بنت خُوَیلِد حضرت خدیجہؓ کی بہن تھیں، مکّہ کے بڑے لوگوں میں سے تھے، اپنے مال، اپنی تجارت اور اپنی امانت کے لحاظ سے ان کا شمار شہر کے گِنے چُنے لوگوں میں ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے حضرت زینبؓ کے ساتھ ان کا نکاح ہو چکا تھا اور حضرت خدیجہؓ ان کو بالکل اپنے بیٹے کی طرح سمجھتی تھیں۔ نبوت کے بعد اگرچہ یہ مسلمان نہ ہوئے اور اپنے شرک ہی پر قائم رہے لیکن انہوں نے قریش کے کسی دباؤ کو قبول نہ کیا اور حضرت زینبؓ کو طلاق دینے سے صاف انکار کر دیا۔[۱] بلاذُری نے اَنساب الاَشراف میں لکھا ہے کہ سردارانِ قریش نے ان سے کہا تم زینب کو طلاق دے دو، قریش کی جس عورت کو تم پسند کرو اس سے ہم تمہاری شادی کرائے دیتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا "خدا کی قسم میں اپنی بیوی کو نہیں چھوڑوں گا وہ بہترین بیوی ہے"۔ یہی بات طَبَری اور ابن ہِشام نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے لکھی ہے اور مزید یہ بھی بیان کیا ہے کہ قریش کے لوگ ابولہب کے بیٹے عُتبہ کے پاس گئے اور کہا کہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی کو چھوڑ دے، قریش کی جس عورت

---

[۱] واضح رہے کہ حضرت زینبؓ اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ ہی مسلمان ہو چکی تھیں، لیکن چونکہ اُس زمانہ میں مشرک و مومن کے درمیان نکاح کی حرمت کا کوئی حکم نہ آیا تھا اس لیے وہ ابوالعاص کے نکاح میں رہیں۔

سے تو چاہے گا ہم تیری شادی کر دیں گے۔ اس نے کہا کہ تم سعید بن عاص کی یا اس کے بیٹے اَبان کی لڑکی مجھے دلوا دو تو میں تمہاری بات مان لوں گا۔ چنانچہ اس کی مرضی کی لڑکی اسے دلوا دی گئی اور اس نے حضورؐ کی صاحبزادی کو طلاق دے دی قبل اس کے کہ رخصتی کی نوبت آتی۔

آپ کے صاحبزادے کی وفات پر اظہارِ مسرت اس سے بھی زیادہ کمینہ حرکت یہ تھی کہ حضورؐ کے پہلے صاحبزادے القاسمؓ کے کم سنی میں وفات پا جانے کے بعد جب آپ کے دوسرے صاحبزادے عبداللہؓ کا بھی کم سنی ہی میں انتقال ہو گیا تو قریش کے لوگوں نے آپ کے ساتھ اس ہمدردی کا اظہار بھی نہ کیا جو شرافت و انسانیت کا کم سے کم تقاضا تھا، بلکہ اُلٹی اس پر خوشیاں منائیں اور آپ کو اَبتر کہنا شروع کر دیا، یعنی "جڑ کٹا آدمی جس کے بعد اس کا کوئی نام لیوا نہ ہو"۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ابن سعد اور ابن عساکر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے صاحبزادے حضرت قاسمؓ تھے، ان سے چھوٹی حضرت زینبؓ تھیں، ان سے چھوٹے حضرت عبداللہؓ تھے۔ پھر علی الترتیب تین صاحبزادیاں ام کلثومؓ، فاطمہؓ اور رقیہؓ تھیں۔ ان میں سے پہلے حضرت قاسمؓ کا انتقال ہوا۔ پھر حضرت عبداللہؓ نے بھی وفات پائی۔ اس پر عاص بن وائل نے کہا "اُن کی نسل ختم ہو گئی، اب وہ ابتر ہیں" (یعنی اُن کی جڑ کٹ گئی ہے)۔ بعض روایات میں اس پر مزید اضافہ یہ ہے کہ عاص نے کہا ان محمداً ابتر، لا ابن لہ یقوم مقامہ بعدہ فاذا مات انقطع ذکرہ و استرحتم منہ۔ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ابتر ہیں، ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے جو ان کا قائم مقام بنے۔ جب وہ مر جائیں گے تو تمہارا ان سے پیچھا چھوٹ جائے گا"۔ عبد بن حُمید نے ابن عباسؓ سے جو روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے صاحبزادے عبداللہ کی وفات پر ابوجہل نے بھی ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔ شِمر بن عَطیہ سے ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضورؐ کے اس غم پر خوشی مناتے ہوئے ایسے ہی کمینہ پن کا مظاہرہ عُقبہ بن ابی مُعیط نے بھی کیا تھا۔ عطاء کہتے ہیں کہ جب حضورؐ کے دوسرے صاحبزادے کا انتقال ہوا تو حضورؐ کا اپنا چچا ابولہب (جس کا گھر بالکل حضورؐ کے گھر سے متصل تھا) دوڑا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور ان کو یہ "خوشخبری" دی کہ بَتِرَ محمدٌ اللیلۃ۔ "آج رات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لاولد ہو گئے، یا اُن کی جڑ کٹ گئی"۔

یہ تھے وہ انتہائی دل شکن حالات جن میں سورۂ کوثر حضورؐ پر نازل کی گئی۔ قریش اس لیے آپ سے بگڑے تھے کہ آپ صرف اللہ ہی کی بندگی و عبادت کرتے تھے اور ان کے شرک کو آپ نے عَلانیہ رد کر دیا تھا۔ اسی

وجہ سے پوری قوم میں جو مرتبہ و مقام آپ کو نبوت سے پہلے حاصل تھا وہ آپ سے چھین لیا گیا اور آپ گویا برادری سے کاٹ پھینکے گئے تھے۔ آپ کے چند مٹھی بھر ساتھی بھی سب بے یار و مددگار تھے اور مارے کھدیڑے جا رہے تھے۔ اس پر مزید آپ پر ایک کے بعد ایک بیٹے کی وفات سے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس موقع پر عزیزوں، رشتہ داروں، قبیلے اور برادری کے لوگوں اور ہمسایوں کی طرف سے ہمدردی و تعزیت کے بجائے وہ خوشیاں منائی جا رہی تھیں اور وہ باتیں بنائی جا رہی تھیں جو ایک ایسے شریف انسان کے لیے دل توڑ دینے والی تھیں جس نے اپنے تو اپنے، غیروں تک سے ہمیشہ انتہائی نیک سلوک کیا تھا۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ کوثر میں فرمایا اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۔ "اے نبیؐ، تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے" یہ محض کوئی "جوابی حملہ" نہ تھا بلکہ درحقیقت یہ قرآن مجید کی بڑی اہم پیشگوئیوں میں سے ایک پیشگوئی تھی جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ جس وقت یہ پیشگوئی کی گئی تھی اس وقت لوگ حضورؐ ہی کو ابتر سمجھ رہے تھے اور کوئی تصوّر بھی نہ کر سکتا تھا کہ قریش کے یہ بڑے بڑے سردار کیسے ابتر ہو جائیں گے جو نہ صرف مکہ میں بلکہ پورے ملک عرب میں نامور تھے، کامیاب تھے، مال و دولت اور اولاد ہی کی نعمتیں ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ سارے ملک میں جگہ جگہ ان کے اعوان و انصار موجود تھے۔ تجارت کے اجارہ دار اور حج کے منتظم ہونے کی وجہ سے تمام قبائلِ عرب سے ان کے وسیع تعلقات تھے۔ لیکن چند سال نہ گزرنے پائے تھے کہ حالات بالکل پلٹ گئے۔ یا تو وہ وقت تھا کہ غزوۂ احزاب ۵ ہجری کے موقع پر قریش بہت سے عرب اور یہودی قبائل کو لے کر مدینے پر چڑھ آئے تھے اور حضورؐ کو محصور ہو کر، شہر کے گرد خندق کھود کر مدافعت کرنی پڑی تھی۔ یا تین ہی سال بعد وہ وقت آیا کہ ۸ ہجری میں جب آپ نے مکہ پر چڑھائی کی تو قریش کا کوئی حامی و مددگار نہ تھا اور انہیں بے بسی کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ اس کے بعد ایک سال کے اندر پورا ملکِ عرب حضورؐ کے ہاتھ میں تھا، ملک کے گوشے گوشے سے قبائل کے وفود آکر بیعت کر رہے تھے، اور آپ کے دشمن بالکل بے بس اور بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر وہ ایسے بے نام و نشان ہوئے کہ اُن کی اولاد اگر دنیا میں باقی رہی بھی تو ان میں سے آج کوئی یہ نہیں جانتا کہ وہ ابوجہل یا ابولہب یا عاص بن وائل یا عُقبہ بن ابی مُعَیط وغیرہ اعدائے اسلام کی اولاد میں سے ہے اور جانتا بھی ہو تو کوئی یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اس کے اسلاف یہ لوگ تھے۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر آج دنیا بھر میں درود بھیجا جا رہا ہے۔ کروڑوں مسلمانوں کو آپ سے نسبت پر فخر ہے۔ لاکھوں انسان آپ ہی سے نہیں بلکہ آپ کے خاندان اور آپ کے ساتھیوں کے خاندانوں سے انتساب کو باعثِ عزّ و شرف سمجھتے ہیں۔

کوئی سید ہے، کوئی علوی ہے، کوئی عباسی ہے، کوئی ہاشمی ہے، کوئی صدیقی ہے، کوئی فاروقی، کوئی عثمانی، کوئی زبیری اور کوئی انصاری۔ مگر نام کو بھی کوئی ابوجہلی یا ابولہبی نہیں پایا جاتا۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ابتر حضورؐ نہیں بلکہ آپ کے دشمن ہی تھے اور ہیں۔

قرآن کی آواز سنتے ہی شور مچا دینا ایک اور ذلیل حرکت جو انہوں نے اختیار کر رکھی تھی وہ یہ تھی کہ جب قرآن پڑھا جاتا تو وہ شور مچاتے اور ہر طرف سے دوڑ پڑتے تھے تاکہ اسے نہ خود سنیں نہ دوسروں کو سننے دیں۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں کئی جگہ کیا گیا ہے،

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا	یہ منکرینِ حق کہتے ہیں اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور
الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ	جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو، شاید کہ
(حٰمٓ السجدہ - آیت ۲۶)	اس طرح تم غالب آجاؤ۔

یہ کفارِ مکہ کے اُن منصوبوں میں سے ایک تھا جس سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کو ناکام کرنا چاہتے تھے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ قرآن اپنے اندر کس بلا کی تاثیر رکھتا ہے، اور اس کو سنانے والا کس پائے کا انسان ہے، اور اس شخصیت کے ساتھ اس کا طرزِ ادا کس درجہ مؤثر ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسے عالی مرتبہ شخص کی زبان سے اس دل کش انداز میں اس بے نظیر کلام کو جو سنے گا وہ آخر کار گھائل ہو کر رہے گا۔ اس لیے انہوں نے یہ پروگرام بنایا کہ اس کلام کو نہ خود سنو، نہ کسی کو سننے دو۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جب بھی اسے سنانا شروع کریں، شور مچاؤ، تالی پیٹ دو، آوازے کسو، اعتراضات کی بوچھاڑ کر دو، اور اتنی آواز بلند کرو کہ ان کی آواز اس کے مقابلے میں دب جائے۔ اس تدبیر سے وہ یہ امید رکھتے تھے کہ اللہ کے نبی کو شکست دے دیں گے۔

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ	پس اے نبیؐ کیا بات ہے کہ یہ منکرین دائیں اور
عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ۔	بائیں سے گروہ در گروہ تمہاری طرف دوڑے چلے
(المعارج آیات ۳۶، ۳۷)	آتے ہیں؟

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ اور تلاوتِ قرآن کی آواز سن کر مذاق اڑانے اور آوازے کسنے کے لیے چاروں طرف سے دوڑ پڑتے تھے۔

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ	اور اپنی نماز نہ بہت بلند آواز سے پڑھو اور
بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ	نہ بہت پست آواز سے۔ ان دونوں کے درمیان

سَبِيلًا (بنی اسرائیل - ۱۱۰) اوسط درجے کا لہجہ اختیار کرو۔

مُسند احمد میں ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ مکّہ میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے گھر میں یا دارِ اَرقم میں) نماز پڑھتے وقت بلند آواز سے قرآن مجید پڑھتے تھے تو کفار شور مچانے لگتے اور بسا اوقات گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتے تھے۔ اس پر حکم ہوا کہ نہ تو اتنے زور سے پڑھو کہ کفار سن کر ہجوم کر آئیں اور نہ اس قدر آہستہ پڑھو کہ تمہارے اپنے ساتھی بھی نہ سن سکیں۔

قرآن کو اُلٹے معنی پہنا کر لوگوں کو بہکانا کفارِ مکّہ کی اس تدبیر کا ذکر بھی قرآن مجید میں کیا گیا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ۗ أَفَمَن يُلْقَىٰ فِي النَّارِ خَيْرٌ أَم مَّن يَأْتِي آمِنًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ ۖ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

(حٰم السجدہ، آیت ۴۰)

جو لوگ ہماری آیات کو اُلٹے معنی پہناتے ہیں وہ ہم سے کچھ چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ خود ہی سوچ لو کہ آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھونکا جانے والا ہے یا وہ جو قیامت کے روز امن کی حالت میں حاضر ہوگا؟ کرتے رہو جو کچھ تم چاہو، تمہاری حرکتوں کو اللہ دیکھ رہا ہے۔

اِلحاد کے معنی ہیں انحراف، سیدھی راہ سے ٹیڑھی راہ کی طرف مڑ جانا، کج روی اختیار کرنا۔ اللہ کی آیات میں الحاد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی سیدھی بات میں سے ٹیڑھ نکالنے کی کوشش کرے۔ آیاتِ الٰہی کا ایک صحیح اور صاف مطلب تو نہ لے، باقی ہر طرح کے غلط معنی ان کو پہنا کر خود بھی گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے۔ کفارِ مکّہ قرآن مجید کی دعوت کو زک دینے کے لیے جو چالیں چل رہے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ قرآن مجید کی آیات سُن کر جاتے اور پھر کسی آیت کو سیاق و سباق سے کاٹ کر کسی آیت میں لفظی تحریف کرکے، کسی فقرے یا لفظ کو غلط معنی پہنا کر طرح طرح کے اعتراضات جڑتے اور لوگوں کو بہکاتے پھرتے تھے کہ لو سنو، آج ان نبی صاحب نے کیا کہہ دیا ہے۔

مسلمانوں کو فضول بحثوں میں اُلجھانا قرآن مجید میں کفار کے اس رویّہ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

وَالَّذِينَ يُحَاجُّونَ فِي اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا اسْتُجِيبَ لَهُ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِندَ رَبِّهِمْ (الشوریٰ - آیت ۱۶)

اللہ کی دعوت پر لبیک کہے جانے کے بعد جو لوگ (لبیک کہنے والوں سے) اللہ کے دین کے معاملے میں جھگڑے کرتے ہیں ان کی حجت بازی ان کے رب کے نزدیک باطل ہے۔

یہ اشارہ ہے اُس صورتِ حال کی طرف جو مکّے میں اُس وقت آئے دن پیش آ رہی تھی۔ جہاں کسی کے متعلق لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے، ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے۔ مدّتوں اس کی جان ضیق میں کیے رکھتے، نہ گھر میں اسے چین لینے دیا جاتا نہ محلے اور برادری میں۔ جہاں بھی وہ جاتا ایک نہ ختم ہونے والی بحث چھیڑ جاتی جس کا مدّعا یہ ہوتا کہ کسی طرح وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر اُسی جاہلیت کی طرف پلٹ آئے جس سے وہ نکلا ہے۔

مسلمانوں کی تضحیک و تذلیل قرآن مجید میں کفار کے اس رویّے کا بھی ذکر کیا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اَجۡرَمُوۡا کَانُوۡا مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یَضۡحَکُوۡنَ ۔ وَ اِذَا مَرُّوۡا بِہِمۡ یَتَغَامَزُوۡنَ وَ اِذَا انۡقَلَبُوۡۤا اِلٰۤی اَہۡلِہِمُ انۡقَلَبُوۡا فَکِہِیۡنَ وَ اِذَا رَاَوۡہُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوۡنَ ۔ وَ مَاۤ اُرۡسِلُوۡا عَلَیۡہِمۡ حٰفِظِیۡنَ ۔ (المطفّفین۔ آیات ۲۹ تا ۳۳)	مجرم لوگ ایمان لانے والوں کا مذاق اُڑاتے تھے اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو آنکھیں مار مار کر ان کی طرف اشارے کرتے تھے، اور جب اپنے گھر والوں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے، اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے تھے کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔

مزے لیتے ہوئے پلٹنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد جب وہ اپنے گھروں کی طرف جاتے تو یہ خیال کرتے ہوئے جاتے تھے کہ آج تو مزا آ گیا، ہم نے فلاں مسلمان کا مذاق اُڑا کر اور اس پر آوازے اور پھبتیاں کس کر خوب لطف اُٹھایا اور لوگوں میں اس کی اچھی گت بنی۔

بلاذری نے انساب الاشراف میں حضرت عُروہ بن زبیر کی روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عمارؓ بن یاسر، خبابؓ بن الارت، صُہیبؓ بن سنان، بلالؓ بن رباح، ابو فُکَیہہؓ اور عامرؓ بن فُہیرہ جیسے لوگوں کو قریش کے سردار مسجد حرام میں بیٹھے دیکھتے تھے تو مذاق اُڑاتے ہوئے کہتے تھے کہ یہ ہیں اس شخص کے ساتھی، کیا ہمارے درمیان صرف یہی لوگ اللہ کے فضل کے مستحق رہ گئے تھے؟

ناواقف لوگوں کو غلط فہمیوں میں ڈالنا اس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ مَّاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّکُمۡ ۙ قَالُوۡۤا اَسَاطِیۡرُ	اور جب کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ تمہارے رب نے یہ کیا چیز نازل کی ہے، تو کہتے ہیں "اجی وہ تو

الْاَوَّلِيْنَ (النحل آیت ۲۴) اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا چرچا جب اطراف واکناف میں پھیلا تو مکے کے لوگ جہاں کہیں جاتے تھے ان سے پوچھا جاتا تھا کہ تمہارے ہاں جو صاحب نبی بن کر اٹھے ہیں وہ کیا تعلیم دیتے ہیں؟ قرآن مجید کس قسم کی کتاب ہے؟ اس کے مضامین کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے سوالات کا جواب کفارِ مکہ ہمیشہ ایسے الفاظ میں دیتے تھے جن سے سائل کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی لائی ہوئی کتاب کے متعلق کوئی نہ کوئی شک بیٹھ جائے، یا کم از کم اس کو آپ سے اور آپ کی نبوت کے معاملے سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہے۔

۴۔ "ثقافتی" پروگرام

اِن گھٹیا تدبیروں کے علاوہ ایک اور تدبیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو زک دینے کے لیے یہ بھی سوچی گئی کہ لوگوں کو قصوں کہانیوں اور گانے بجانے اور عیش وعشرت میں غرق کر کے اِس قابل ہی نہ رکھا جائے کہ وہ اُن سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کر سکیں جو قرآن مجید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سامنے پیش فرما رہے تھے۔

ابنِ ہشام نے سیرت میں محمد ابن اسحاق کی روایت نقل کی ہے کہ بنی عبدالدار کے نَضر بن الحارث بن کَلَدَہ نے قریش کے ایک مجمع میں کہا "تم لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مقابلہ جس طرح کر رہے ہو اس سے کام نہ چلے گا۔ وہ جب تمہارے درمیان نوعمر جوان تھا تو تمہارا سب سے زیادہ خوش اطوار آدمی تھا۔ سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑھ کر امین سمجھا جاتا تھا۔ اب کہ اس کے بال سفید ہونے کو آگئے اور وہ تمہارے پاس وہ چیز لے کر آیا جو وہ لایا ہے تو تم کہتے ہو کہ یہ ساحر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے، مجنون ہے۔ بخدا وہ ساحر نہیں ہے۔ ہم نے ساحروں کو دیکھا ہے اور ان کی جھاڑ پھونک سے ہم واقف ہیں۔ بخدا وہ کاہن بھی نہیں ہے۔ ہم نے کاہنوں کی تُک بندیاں سُنی ہیں اور جیسی گول مول باتیں وہ کیا کرتے ہیں اُن کا ہمیں علم ہے۔ بخدا وہ شاعر بھی نہیں ہے۔ شعر کی تمام اصناف سے ہم واقف ہیں اور اس کا کلام ان میں سے کسی صنف میں نہیں آتا۔ بخدا وہ مجنون بھی نہیں ہے مجنون کی جو حالت ہوتی ہے اور جیسی بے تکی بڑ وہ ہانکتا ہے کیا اُس سے ہم بے خبر ہیں؟ اے سردارانِ قریش، کچھ اور بات سوچو۔ جس چیز کا مقابلہ تمہیں درپیش ہے وہ اس سے زیادہ بڑی ہے کہ یہ باتیں بنا کر تم اسے شکست دے سکو"۔ اس کے بعد اس نے یہ تجویز پیش کی کہ عجم سے رستم واسفندیار کے قصّے لا کر پھیلائے جائیں تاکہ لوگ ان میں دلچسپی لینے لگیں اور وہ اُنہیں قرآن مجید سے زیادہ عجیب معلوم ہوں۔ چنانچہ کچھ دنوں اس پر عمل کیا گیا

اور خود نضر نے داستان گوئی شروع کر دی۔

یہی روایت اسباب النزول میں واحدی نے کلبی اور مقاتل سے نقل کی ہے۔ اور ابن عباسؓ نے اس پر مزید یہ اضافہ کیا ہے کہ نضر نے اس مقصد کے لیے گانے والی لونڈیاں بھی خریدی تھیں۔ جس کسی کے متعلق وہ سنتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں سے متاثر ہو رہا ہے اُس پر اپنی کوئی لونڈی مسلط کر دیتا اور اس سے کہتا کہ اسے خوب کھلا پلا اور گانا سنا تاکہ تیرے ساتھ مشغول ہو کر اس کا دل اُدھر سے ہٹ جائے۔

۵۔ جھوٹ کی مہم اور اس کے اثرات

اِن تدبیروں کے ساتھ قریش نے حضورؐ کی دعوتِ عام شروع ہوتے ہی ہر طرف آپ کے خلاف جھوٹ کی ایک مہم بھی چلا دی تاکہ لوگوں کو آپ سے بدگمان اور متنفر کیا جائے۔ اس مہم میں چونکہ صداقت کا کوئی سوال نہ تھا بلکہ محض بدنام کرنا اور لوگوں کو آپ سے دُور بھگانا مقصود تھا اس لیے جس کے منہ میں جو آتا وہ کہتا پھرتا۔ کوئی کہتا کہ آپ شاعر ہیں۔ کوئی کہتا ساحر (جادوگر) ہیں۔ کوئی کہتا سحر زدہ ہیں یعنی کسی نے آپ پر جادو کر دیا ہے۔ کوئی کہتا کہ آپ مجنون ہیں۔ غرض کوئی ایک بات نہ تھی جو لوگ آپ کے متعلق کہتے ہوں۔ یہ چرچے نہ صرف مکہ کے ہر گلی کوچے میں کیے جاتے تھے بلکہ اسی قسم کی باتیں ہر اس شخص سے کی جاتی تھیں جو مکہ میں زیارت یا تجارت یا کسی اور غرض سے آتا تھا اور کوشش کی جاتی تھی کہ کوئی آپ کی بات کسی طرح سُنے ہی نہیں جس سے اس کے متاثر ہو جانے کا اندیشہ ہو۔

پہلے حج کے موقع پر قریش کی مشاورت چند مہینے اس حال پر گزرے تھے کہ حج کا زمانہ آ گیا اور مکے کے لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس موقع پر تمام عرب سے حاجیوں کے قافلے آئیں گے، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قافلوں کی قیام گاہوں پر جا جا کر آنے والے حاجیوں سے ملاقاتیں کیں اور حج کے اجتماعات میں جگہ جگہ کھڑے ہو کر قرآن جیسا بے نظیر اور مؤثر کلام سنانا شروع کر دیا، تو عرب کے ہر گوشے تک ان کی دعوت پہنچ جائے گی اور نہ معلوم کون کون اس سے متاثر ہو جائے۔ ابن اسحاق، حاکم اور بیہقی نے عمدہ سند کے ساتھ یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ اس موقع پر قریش کے سرداروں نے ایک کانفرنس کی جس میں طے کیا گیا کہ حاجیوں کے آتے ہی اُن کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ اس پر اتفاق ہو جانے کے بعد ولید بن مغیرہ نے حاضرین سے کہا کہ اگر آپ لوگوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق مختلف باتیں لوگوں سے کہیں تو ہم سب کا

اعتبار رجاتا رہے گا۔ اس لیے کوئی ایک بات طے کر لیجیے جسے سب بالاتفاق کہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کاہن کہیں گے۔ ولید نے کہا نہیں، خدا کی قسم وہ کاہن نہیں ہیں، ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے، جیسی باتیں وہ گنگناتے ہیں اور جس طرح کے فقرے وہ جوڑتے ہیں، قرآن کو اس سے دُور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ کچھ اور لوگ بولے، انہیں مجنون کہا جائے۔ ولید نے کہا وہ مجنون بھی نہیں ہیں۔ ہم نے دیوانے اور پاگل دیکھے ہیں۔ اس حالت میں آدمی جیسی بہکی بہکی باتیں اور اُلٹی سیدھی حرکات کرتا ہے وہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ کون باور کرے گا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کلام پیش کرتے ہیں وہ دیوانے کی بڑ ہے یا جنون کے دورے میں آدمی یہ باتیں کر سکتا ہے؟ لوگوں نے کہا اچھا تو پھر ہم شاعر کہیں گے۔ ولید نے کہا، وہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ ہم شعر کی ساری اقسام سے واقف ہیں۔ اس کلام پر شاعری کی کسی قسم کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔ لوگ بولے، تو پھر ان کو ساحر کہا جائے گا۔ ولید نے کہا وہ ساحر بھی نہیں ہیں۔ جادوگروں کو ہم جانتے ہیں اور اپنے جادو کے لیے جو طریقے وہ اختیار کرتے ہیں ان سے بھی ہم واقف ہیں۔ یہ بات بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر چسپاں نہیں ہوتی۔ پھر ولید نے کہا ان باتوں میں سے جو بات بھی کرو گے لوگ اس کو ناروا الزام سمجھیں گے۔ خدا کی قسم اِس کلام میں بڑی حلاوت ہے۔ اِس کی جڑ بڑی گہری اور اس کی ڈالیاں بڑی ثمردار ہیں۔ (ابن جریر نے اپنی تفسیر میں عکرمہ کی روایت سے یہ اضافہ کیا ہے کہ اِس پر ابوجہل ولید کے سر ہو گیا اور اس نے کہا تمہاری قوم تم سے راضی نہ ہو گی جب تک تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں کوئی بات نہ کہو)۔ ولید نے کہا اچھا مجھے سوچ لینے دو۔ پھر سوچ سوچ کر بولا قریب ترین بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ تم عرب کے لوگوں سے کہو یہ شخص جادوگر ہے، یہ ایسا کلام پیش کر رہا ہے جو آدمی کو اس کے باپ، بھائی، بیوی بچوں اور سارے خاندان سے جدا کر دیتا ہے۔ ولید کی اس بات کو سب نے قبول کر لیا۔ پھر ایک منصوبے کے مطابق حج کے زمانے میں قریش کے وفود حاجیوں کے درمیان پھیل گئے اور انہوں نے آنے والے زائرین کو خبردار کرنا شروع کیا کہ یہاں ایک ایسا شخص اُٹھ کھڑا ہوا ہے جو بڑا جادوگر ہے اور اس کا جادو خاندانوں میں تفرقہ ڈال دیتا ہے، اس سے ہوشیار رہنا۔

اِس واقعہ پر قرآن کا تبصرہ ولید بن مغیرہ کی اِسی حرکت پر سورۂ مدّثر آیات ۱۱ تا ۲۵ میں یہ تبصرہ فرمایا گیا ہے:

"چھوڑ دو مجھے اور اُس شخص کو"۔ یعنی اُس سے میں ہی نمٹ لوں گا، تمہیں اس کی فکر کی ضرورت نہیں۔ "جسے میں نے اکیلا پیدا کیا"۔ یعنی وہ کچھ ساتھ لے کر دنیا میں نہیں آیا تھا۔ "بہت سا مال اس کو دیا اور اس کے ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے دیے"۔ یعنی اس کو دس بارہ جوان جوان بیٹے دیے، جو سب نامور ہیں، مجلسوں میں اس کے ساتھ رہتے

ہیں۔ (خالدؓ بن ولید جیسے لائق فرزند بھی ان میں شامل تھے) "اور اُس کے لیے ریاست کی راہ ہموار کی۔ پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اس کو اور زیادہ دوں۔ ہرگز نہیں۔ میں تو عنقریب اُسے ایک کٹھن چڑھائی چڑھواؤں گا۔ اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی۔ تو خدا کی مار اُس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ ہاں خدا کی مار اُس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ پھر لوگوں کی طرف دیکھا۔ پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا۔ پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا۔ آخرکار بولا تو یہ کہ قرآن کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آرہا ہے۔ یہ تو ایک انسانی کلام ہے۔"

اُوپر جس واقعہ کا ہم ذکر کر چکے ہیں اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ولید دل میں قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا قائل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اپنی قوم میں اپنی ریاست و وجاہت کو بچانے کے لیے اپنے ضمیر سے جس طرح وہ لڑا، اور جس شدید ذہنی کشمکش میں کافی دیر تک مبتلا رہنے کے بعد آخرکار اُس نے قرآن کے خلاف ایک بات بنائی اس کی تصویر ان آیات میں کھینچ دی گئی ہے۔

دائمی اور وسیع پیمانے پر جھوٹ یہ جھوٹ کی مہم صرف حج ہی کے موقع پر نہیں چلتی تھی بلکہ سال کے بارہ مہینے، اور مہینوں کے ۳۰ دن شب و روز اس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مکّہ کے عوام کو بھی ہر وقت آپ کے خلاف بہکایا جاتا تھا، باہر سے آنے والوں کو بھی آپ سے خبردار رہنے اور آپ کے قریب نہ جانے کی تاکید کی جاتی تھی، عرب کے میلوں، عکاظ، مجنّۃ اور ذوالمجاز میں بھی قریش کے وفود پھیل جاتے تھے اور آپ کے خلاف ہر طرح کے وسوسے دلوں میں ڈالتے تھے، اور خاص طور سے ہر سال حج کے موقع پر تو ان کے وفد حاجیوں کے ایک ایک پڑاؤ پر جاتے اور ہر وہ ممکن بات آپ کی مخالفت میں پھیلاتے تھے جس سے لوگ آپ کی بات سننے سے پرہیز کرنے لگیں اور آپ کی ذات کو اپنے لیے ایک خطرہ سمجھنے لگیں۔

مکّہ سے باہر اسلام کی اشاعت قریش اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کو زک دے دیں گے، لیکن دراصل اس طرح انہوں نے خود ہی عرب کے گوشے گوشے تک آپ کا اسم گرامی پہنچا دیا۔ آپ کی جتنی شہرت مسلمانوں کی کوششوں سے سالہا سال میں بھی نہ ہو سکتی تھی وہ قریش کی اس مہم سے تھوڑی مدت ہی میں ہو گئی۔ عام لوگ چاہے اُس سے بدگمان ہی ہو گئے ہوں، مگر بہت سے دلوں میں آپ سے آپ یہ سوال پیدا ہو گیا کہ آخر معلوم تو ہو وہ کونسا ایسا آدمی ہے جس کے خلاف یہ طوفان برپا ہو رہا ہے، اور بہت سے لوگوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ وہ بات سُنی تو جائے جس سے ہم کو اتنا خوف دلایا جا رہا ہے۔ اس طرح مکّہ سے باہر عرب کے دوسرے علاقوں میں اسلام کے پہنچنے کا راستہ کھل گیا۔

طُفَیل بن عَمرو دَوسی کا اسلام یہ قبیلۂ دَوس کے ایک بڑے سوار اور اس کے اشراف میں سے تھے۔ ابن اسحاق اور ابن سعد نے ان کے اسلام لانے کا قصہ خود اُن کی روایت سے بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں قبیلۂ دَوس کا ایک شاعر تھا۔ کسی کام سے مکے گیا۔ وہاں پہنچتے ہی قریش کے چند لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف خوب میرے کان بھرے، یہاں تک کہ میں آپ سے سخت بدگمان ہوگیا اور میں نے طے کر لیا کہ آپ سے بچ کر ہی رہوں گا۔ دوسرے روز میں نے حرم میں حاضری دی تو آپ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ میرے کانوں میں چند جملے جو پڑے تو میں نے محسوس کیا کہ یہ تو کوئی بڑا اچھا کلام ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں ایک شاعر ہوں، جوان مرد ہوں، عقل رکھتا ہوں، کوئی بچہ نہیں ہوں کہ صحیح اور غلط میں تمیز نہ کرسکوں، آخر کیوں نہ اس شخص سے مل کر معلوم کروں کہ یہ کیا کہتا ہے۔ چنانچہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوکر واپس چلے تو میں آپ کے پیچھے پیچھے ہولیا اور آپ کے مکان پر پہنچ کر میں نے عرض کیا کہ آپ کی قوم نے آپ کے متعلق مجھ سے یہ کچھ کہا تھا اور میں آپ سے اس قدر بدگمان ہوگیا تھا کہ میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی تاکہ آپ کی آواز نہ سننے پاؤں۔ لیکن ابھی جو چند کلمے میں نے آپ کی زبان سے سُنے ہیں وہ مجھے کچھ اچھے معلوم ہوئے۔ آپ مجھے ذرا تفصیل سے بتائیے آپ کیا کہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں مجھ کو قرآن مجید کا ایک حصہ سُنایا اور میں اس سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُسی وقت ایمان لے آیا۔ پھر جب میں گھر واپس گیا تو میرے بوڑھے باپ آئے۔ میں نے کہا ابا جان مجھ سے دُور رہیے۔ نہ میں آپ کا کوئی ہوں اور نہ آپ میرے کوئی۔ انھوں نے پوچھا کیوں؟ میں نے کہا میں مسلمان ہوگیا ہوں اور میں نے دینِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کر لی ہے۔ انھوں نے کہا بیٹا جو تیرا دین سو میرا دین۔ میں نے کہا جا کر غسل کیجیے اور کپڑے پاک کیجیے، پھر میرے پاس آیئے تاکہ میں آپ کو اُس دین کی تعلیم دوں جو میں سیکھ کر آیا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور مسلمان ہوگئے۔ پھر میری بیوی آئی۔ میں نے اس سے بھی وہی بات کہی جو اپنے باپ سے کہی تھی۔ اس نے کہا میرے ماں باپ تم پر قربان، تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا میرے اور تیرے درمیان اسلام نے تفریق کر دی ہے اور میں دینِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیرو ہوگیا ہوں۔ اس نے کہا تو مجھے اپنا دین بتاؤ۔ میں نے کہا "ذوالشَّریٰ (قبیلۂ دَوس کے بت) کے حِمیٰ[1] میں جا اور وہاں پہاڑ سے گرنے والے چشمے سے غسل کر۔"

---

[1] حِمیٰ اُس رقبے کو کہتے ہیں جو کسی سردار، رئیس یا دیوتا کے لیے مخصوص ہو اور جس میں داخل ہونا گویا اس کے مالک کا غضب مول لینا ہو

اُس نے کہا" ذوالشریٰ سے میرے بچوں کو تو کوئی خطرہ نہ ہوگا"؟ میں نے کہا" نہیں، میں اِس کا ذمہ لیتا ہوں"۔ وہ گئی اور غسل کر کے آگئی۔ میں نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا اور وہ بھی مسلمان ہوگئی۔ پھر میں نے دَوس میں اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ مگر وہ قبول کرنے میں متأمل تھے۔ میں حضورؐ کے پاس پھر مکہ واپس آیا اور عرض کیا کہ دَوس پر غفلت طاری ہے جو میری راہ میں حائل ہو رہی ہے۔ آپ ان کے حق میں دعا فرمائیں۔ حضورؐ نے دعا فرمائی کہ خدایا دَوس کو ہدایت دے۔ اور مجھے نصیحت فرمائی کہ جا کر ان میں پھر تبلیغ کرو اور ان سے نرمی کے ساتھ برتاؤ کرو۔ چنانچہ میں دوس میں دعوت کا کام کرتا رہا یہاں تک کہ غزوۂ خیبر کے موقع پر وہاں کے ۷۰۔۸۰ مسلمان گھرانوں کو لے کر پہنچا۔

حضرت ابوذرؓ غِفاری کا اسلام یہ قبیلۂ بنی غِفار سے تھے جو رہزنی کے لیے مشہور تھا اور خود حضرت ابوذر ایک زمانے میں ایسے زبردست ڈاکو تھے کہ اکیلے کسی قافلے پر اس طرح جا پڑتے تھے جیسے کوئی درندہ ٹوٹ پڑا ہو۔ مگر اسلام لانے سے تین سال پہلے ان کا دل پلٹ گیا تھا اور انھوں نے کسی نہ کسی طرح کی نماز پڑھنی شروع کر دی تھی۔ مُسنداحمد اور ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ" میں تین سال پہلے ہی سے اللہ کے لیے جس طرف بھی رُخ ہوتا نماز پڑھا کرتا تھا"۔ ان کا اصل نام جُندُب بن جُنادَہ تھا۔ بخاری کی روایت ہے کہ جب ان کو حضورؐ کی بعثت کی خبر پہنچی تو انھوں نے اپنے بھائی کو (جن کا نام مُسنداحمد میں اُنَیس بیان کیا گیا ہے) بھیجا کہ مکہ جا کر اس شخص کے متعلق معلومات حاصل کریں جو کہتا ہے کہ میں نبی ہوں۔ وہ گیا اور واپس آکر اس نے اطلاع دی کہ وہ مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں اور ایسا کلام پیش کرتے ہیں جو شعر نہیں ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے کہا میں جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا وہ تم نہیں لائے۔ پھر وہ خود مکہ گئے اور مسجدِ حرام میں حضورؐ کو تلاش کرنے لگے۔ مگر چونکہ آپؐ کو پہچانتے نہ تھے اور کسی سے پوچھنا بھی نہ چاہتے تھے، اس لیے مل نہ سکے۔ حضرت علیؓ نے ان کو دیکھا کہ یہ کوئی اجنبی مسافر ہیں، مگر اُن سے کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ تیسرے دن حضرت علیؓ نے کہا کیا چیز تمھیں لائی ہے؟ انھوں نے کہا کہ اگر تم وعدہ کرو کہ مجھے میرے مقصود تک پہنچا دو گے تو میں تمھیں بتاؤں کہ کیوں آیا ہوں۔ حضرت علیؓ نے وعدہ کیا، تب انھوں نے اپنا مقصد بیان کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا وہ یقیناً حق پر ہیں اور اللہ کے رسول ہیں۔ کل صبح تم میرے پیچھے پیچھے آنا۔ اگر میں چلتا رہوں تو تم بھی چلتے رہنا اور جہاں میں داخل ہوں وہاں داخل ہو جانا۔ اور اگر میں نے کوئی ایسی بات دیکھی جس سے مجھے تمھارے حق میں خطرہ محسوس ہوا تو میں اس طرح کھڑا ہو جاؤں گا جیسے پانی گرا رہا ہوں۔ یہ دیکھ کر تم رک جانا۔ غرض اس طرح حضرت ابوذر حضورؐ کی خدمت میں پہنچے، آپؐ کا کلام

سُنا اور اسی وقت مسلمان ہوگئے۔ حضورؐ نے فرمایا "اب تم اپنی قوم میں واپس جاؤ اور لوگوں کو دین سے باخبر کرتے رہو، یہاں تک کہ تمہیں میرے حال کی اطلاع ملے"۔ حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا کہ جس خدا نے آپ کو بھیجا ہے اس کی قسم، میں اہلِ مکہ کے درمیان حق کا اظہار کر کے رہوں گا۔ چنانچہ وہ مسجدِ حرام میں پہنچے اور پکار کر کہا اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ یہ سُنتے ہی لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور اتنا مارا کہ وہ گر پڑے۔ یہ حال دیکھ کر حضرت عباسؓ ان کے اور لوگوں کے درمیان حائل ہوگئے اور کہا کم بختو، تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ یہ بنی غفار میں سے ہے جو تمہارے شام کے تجارتی راستے پر رہتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے ابوذرؓ کو ان سے چھڑایا۔ دوسرے روز انہوں نے پھر یہی کیا، اور پھر لوگوں نے ان کو مارا اور پھر حضرت عباسؓ نے ان کو چھڑایا۔

امام احمد نے مُسند میں خود حضرت ابوذرؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں اور میرا بھائی اُنیس اور میری ماں مکّے کے باہر ٹھیرے ہوئے تھے۔ انیس نے کہا میں ذرا مکّہ ہو کر آتا ہوں، تم میرا انتظار کرو۔ پھر وہ بڑی دیر کے بعد آیا۔ تو میں نے پوچھا اتنی دیر کہاں لگی؟ اس نے کہا میں ایک شخص سے ملا جو کہتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور اللہ نے اسے اُسی دین پر بھیجا ہے جو تمہارا دین ہے (یعنی شرک کا انکار اور توحید کا اقرار)۔ میں نے پوچھا کہ لوگ اسے کیا کہتے ہیں۔ اس نے کہا وہ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے، کاہن ہے، ساحر ہے۔ اُنیس خود شاعر تھا۔ اس نے کہا میں نے کاہنوں کی باتیں بھی سُنی ہیں، شعر بھی جانتا ہوں۔ مگر اُس کی باتوں کا اِن چیزوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خدا کی قسم وہ سچا ہے اور لوگ جھوٹے ہیں۔ میں نے کہا تم میرے پیچھے دیکھ بھال کرو تاکہ میں خود وہاں جاؤں؟ اُس نے کہا، ہاں، مگر اہلِ مکّہ سے ہوشیار رہنا کیونکہ وہ اس کی مخالفت پر تُلے ہوئے ہیں۔ میں مکہ پہنچا اور ایک شخص کو کمزور سا پاکر اس سے پوچھا کہ وہ شخص کہاں ہے جسے لوگ صابی (دین سے پھرا ہوا) کہتے ہیں۔ اس پر اس شخص نے میری طرف اشارہ کر دیا اور لوگ مجھ پر ٹوٹ پڑے اور جو ہاتھ میں آیا مجھ پر دے مارا یہاں تک کہ میں غش کھا کر گر پڑا۔ ہوش میں آکر حرم میں گیا۔ زمزم کا پانی پیا، زخم دھوئے، اور تیس دن تک کعبے کے پردوں کے پیچھے چھپا رہا۔ اس پوری مدت میں زمزم کے سوا میری کوئی غذا نہ تھی، جس سے نہ صرف یہ کہ میری بھوک مٹ جاتی تھی بلکہ میں پہلے سے کچھ زیادہ ہی موٹا ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ حرم میں آئے، حجرِاسود کو بوسہ دیا، طواف کیا اور نماز پڑھی۔ میں نے نکل کر پہلی مرتبہ اُن کو اسلامی طریقہ پر سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا علیك السّلام

پھر پوچھا تم کون ہو؟ میں نے کہا بنی غِفار میں سے ہوں۔ پوچھا یہاں کب سے ہو؟ میں نے کہا تیس شب و روز سے۔ پوچھا تمہیں کھلاتا کون تھا؟ میں نے کہا زمزم کے سوا میری کوئی غذا نہ تھی، اُس سے نہ صرف میری بھوک مٹی بلکہ میں کچھ موٹا ہی ہو گیا۔ آپ نے فرمایا وہ برکت والا پانی ہے اور پانی ہی نہیں غذا بھی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا مجھے اجازت دیجیے کہ آج رات یہ میرے ہاں کھانا کھائیں۔ حضورؐ نے اجازت دے دی۔ آپ تشریف لے گئے اور میں ابوبکرؓ کے ساتھ ان کے ہاں گیا اور انہوں نے مجھے طائف کی کشمش کھلائی۔ پھر میں کچھ مدت تک ٹھیرا رہا۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا "مجھے ایک ایسی سرزمین کی طرف نشان دہی کی گئی ہے جہاں نخلستان ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ جگہ یثرب کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ کیا تم میرا پیغام اپنی قوم میں پہنچاؤ گے؟ شاید کہ وہ ان کو فائدہ بخشے اور تمہیں بھی اس کا اجر ملے"۔ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ پھر میں اپنے بھائی اور ماں کے پاس واپس پہنچا۔ انہوں نے پوچھا کیا کر آئے؟ میں نے کہا اسلام لے آیا اور تصدیق کی۔ انیس نے کہا میں بھی تمہارے دین سے الگ نہیں رہنا چاہتا، میں نے بھی اسلام قبول کیا اور تصدیق کی۔ ہماری ماں بولیں میں بھی تم دونوں کے دین سے الگ نہیں رہنا چاہتی۔ میں نے بھی اسلام قبول کیا اور تصدیق کی۔ اس کے بعد ہم اپنی قوم غِفار میں پہنچے اور ان میں سے کچھ لوگ حضورؐ کی مدینہ تشریف آوری سے پہلے ہی مسلمان ہو گئے۔ ان کو خُفافَ بن اَیماء بن رَحضَۃ الغِفاری نماز پڑھایا کرتے تھے کیونکہ وہی قوم کے سردار تھے۔ پھر ہجرت کے بعد باقی بنی غِفار بھی مسلمان ہو گئے۔ (مسلم نے بھی یہ قصہ اسی طرح روایت کیا ہے۔ طبَرانی نے اَوسَط میں اس قصے کی زیادہ تفصیلات نقل کی ہیں)۔

ابن سعد کی روایت میں بھی اگرچہ یہ قصہ اُسی طرح درج ہے جس طرح اُوپر گزرا مگر اس کے بیچ میں حضرت ابوذرؓ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ جب میں کعبہ کے پردوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا اور مُطاف میں دو عورتوں کے سوا کوئی نہ تھا تو میں نے سُنا کہ وہ اِساف اور نائلہ کا ذکر کر رہی ہیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہا ان دونوں کا نکاح کرا دو۔ اس پر وہ بہت بگڑیں اور کہنے لگیں، کاش ہمارے آدمیوں میں سے کوئی یہاں ہوتا۔ اُدھر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ پہاڑی سے اُترتے ہوئے تشریف لا رہے تھے۔ یہ عورتیں شاید اُن کو جانتی نہ تھیں۔ انہوں نے پوچھا تم کیوں ناراض ہو رہی ہو۔ وہ کہنے لگیں ایک صابی (یعنی بدمذہب) کعبہ کے پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ حضورؐ نے پوچھا اس نے تمہیں کیا کہا؟ کہنے لگیں ایسی بڑی بات کہہ دی جو منہ سے نکالنے کے قابل نہیں۔

عَمرو بن عَبَسہؓ سُلَمی کا اسلام یہ بنی سُلَیم میں سے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ چوتھے مسلمان ہیں۔ مگر جو واقعہ انہوں نے

خود اپنے مسلمان ہونے کا بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی دعوتِ عام شروع ہونے کے بعد حضورؐ کا ذکر سُن کر مسلمان ہوئے تھے۔ ابن سعد کی ایک روایت میں یہ ہے کہ یہ عکاظ کے بازار میں حضورؐ سے ملے اور وہیں مسلمان ہوگئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ اُس وقت تبلیغی دورے شروع کر چکے تھے۔ دوسری روایت جو ابن سعد اور مسلم نے ابو اُمامہ باہلی سے نقل کی ہے اس میں عمرو بن عَبَسہ رضؓ خود کہتے ہیں کہ میں جاہلیت میں لوگوں کو گمراہی پر سمجھتا تھا اور بتوں کو ہیچ خیال کرتا تھا۔ پھر میں نے سُنا کہ مکّہ میں ایک شخص ہے جو کچھ خبریں دیتا اور کچھ باتیں بیان کرتا ہے۔ چنانچہ میں مکّہ گیا اور میں نے دیکھا کہ حضورؐ چھپے ہوئے ہیں اور قوم آپ کے معاملہ میں دو حصّوں میں منقسم ہے۔ میں احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ آپ تک پہنچا اور آپ سے پوچھا آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا نبی۔ میں نے پوچھا نبی کیا ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ کا رسول۔ میں نے پوچھا کیا اللہ نے آپ کو بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ میں نے پوچھا کس تعلیم کے ساتھ بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ کہ صرف اللہ کو معبود مانا جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ بتوں کو توڑ دیا جائے، اور صلۂ رحمی کی جائے۔ میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے ساتھ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا آزاد بھی ہیں اور غلام بھی۔ اس وقت ابو بکرؓ اور بلالؓ موجود تھے (اسی سے ان کو غلط فہمی ہوئی کہ چوتھے وہ ہیں)۔ میں نے عرض کیا میں آپ کے ساتھ رہوں؟ آپ نے فرمایا اس زمانے میں تم ایسا نہیں کر سکتے جب تم سنو کہ میں ظاہر ہوگیا ہوں تو مجھ سے آملنا۔ چنانچہ میں اپنے لوگوں میں واپس چلا گیا۔

ضماد الاَزدیؓ کا اسلام | یہ اَزدِ شَنُوءَہ میں سے تھے اور جھاڑ پھونک کا کام کرتے تھے۔ حافظ ابن عبد البرّ اور حافظ ابن حجر اور حافظ ابن حبّان کا بیان ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں یہ حضورؐ کے دوست تھے۔ مسلم، نسائی، بیہقی اور ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ مکہ آئے تو یہاں کے اوباشوں نے ان سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مجنون ہوگئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے بتاؤ وہ کہاں ہیں۔ شاید اللہ میرے ہاتھ سے ان کو شفا دے دے۔ چنانچہ وہ آپ کے پاس آئے اور کہا کہ میں جھاڑ پھونک کا کام کرتا ہوں اور میرے ہاتھ سے اللہ جس کو چاہتا ہے شفا دے دیتا ہے۔ آیئے میں آپ کا علاج کر دوں۔ حضورؐ نے پہلے کلمۂ شہادت ادا کیا، پھر اللہ کی حمد کی اور اس کے بعد کچھ کلمات ارشاد فرمائے۔ ضماد کو یہ باتیں بہت پسند آئیں اور انہوں نے کہا پھر فرمایئے۔ آپؐ نے تین مرتبہ ان کا اعادہ کیا۔ ضماد نے کہا میں نے ایسا کلام کبھی نہیں سُنا۔ میں نے کاہنوں کا کلام سُنا ہے۔ شاعروں کا کلام سنا ہے، ساحروں کا کلام سنا ہے، مگر ایسا کلام نہیں سنا۔ یہ تو سمندر کی تہ تک پہنچتا ہے۔ پھر انہوں نے اسلام قبول کیا اور اپنی طرف سے اور اپنی قوم کی طرف سے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا اسلام | یہ بھی یمن سے آکر مکّہ میں اسلام لائے۔ پھر واپس جا کر اپنے بھائیوں ابو بُردہ اور

ابو رُہم اور تقریباً ۵۰ آدمیوں کو مسلمان کیا۔ اس کے بعد یمن سے یہ سب مسلمان ایک کشتی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے اور ہواؤں نے ان کو حبش کے ساحل پر لا پھینکا جہاں یہ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور دوسرے مہاجرین سے مل گئے۔ یہ ابن سعد اور ابن عبد البرّ کا بیان ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ حبش نہیں گئے تھے بلکہ جب یہ مکہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو ان کی کشتی اُن مہاجرین حبشہ کی کشتی کے ساتھ مل گئی جو مدینہ کی طرف جا رہے تھے اور ایک ساتھ حضورؐ کے پاس خیبر پہنچے۔

مُعَیقیبؓ بن ابی فاطمۃ الدّوسی کا اسلام | ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ بھی قبیلۂ دَوس کے تھے اور مکہ میں اسلام لائے۔ ایک روایت یہ ہے کہ مسلمان ہو کر یہ اپنے وطن واپس چلے گئے تھے اور دوسری روایت کے مطابق دوسری ہجرت حبشہ میں یہ بھی شامل تھے۔ ابن حجرؒ اور ابن عبد البرؒ نے ان کا شمار ان لوگوں میں کیا ہے جو مکہ میں اسلام لائے تھے اور ہجرت حبشہ ثانیہ میں شریک ہوئے تھے۔

جُعَالؓ بن سُراقہ | یہ بنی ضمرہ میں سے تھے۔ ابن سعد اور ابن عبد البرؒ کا بیان ہے کہ یہ بھی مکہ میں اسلام لائے۔

عبد اللہؓ اور عبد الرحمٰنؓ کِنانی | ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ دونوں بھائی بنی کِنانہ کے ایک شخص لُہَیب کے بیٹے تھے اور انہوں نے بھی مکہ میں اسلام قبول کیا۔

بُرَیدہؓ بن الحُصَیب کا اسلام | ابن سعد اور ابن عبد البرّ کا بیان ہے کہ یہ بنی خُزاعہ کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو خزاعہ کے خاندان سے الگ ہو گئی تھی۔ ہجرت کے وقت جب حضور مکہ سے مدینہ تشریف لے جا رہے تھے اس وقت غُمیم کے مقام پر یہ آپ سے ملے اور ان کے ساتھ ۸۰ گھرانوں نے اسلام قبول کیا۔ یہی ابن حجرؒ نے اصابہ میں لکھا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پہلے سے یہ لوگ اسلام سے متاثر ہو چکے تھے، ورنہ ظاہر ہے کہ محض سفر میں چلتے چلتے ایک ہی ملاقات کا نتیجہ یہ نہیں ہو سکتا کہ اسّی گھر مسلمان ہو جائیں۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش نے اگرچہ حضورؐ کے خلاف جھوٹ کی مہم چلا کر پورے عرب کے لوگوں کو آپ سے بدظن کر دینے کی کوشش میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی، لیکن اس ذریعہ سے نہ صرف یہ کہ انہوں نے خود ہی آپؐ کو عرب میں مشہور کر دیا، بلکہ بہت سی سعید رُوحوں کو آپؐ کی طرف متوجہ بھی کر دیا۔ مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ اسی مہم کی وجہ سے جستجوئے حق میں آپ کی طرف راغب ہوئے اور اِس طرح مکہ سے باہر دوسرے قبائل میں اسلام پہنچ گیا۔ یہی بات ہے جس کے متعلق سورۂ الم نشرح میں فرمایا گیا ہے وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ یعنی آپؐ اِس جھوٹے پروپیگنڈے سے دل برداشتہ کیوں ہوتے ہیں، ہم نے تو آپؐ کے دشمنوں ہی کے ذریعہ سے آپؐ کا آوازہ بلند کر دیا ہے۔

(باقی)

اِتمامِ نعمت

سید ریاض الحسن صاحب ایڈووکیٹ سپریم کورٹ

علمِ اجتماعیات (SOCIOLOGY) میں یہ امر مسلّم ہے کہ جب ایک سوسائٹی اس قابل ہو جاتی ہے کہ اس میں تمام شعبہ ہائے حیات قائم ہو جاتے ہیں تو اس کے بعد وہ معاشرہ ارتقاء کی جتنی منازل چاہے طے کر جائے، اس میں پیچیدگی (COMPLEXITY) تو آسکتی ہے۔ اور کوئی اجتماعی امر (SOCIAL TRAIT) نئی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ اس میں کوئی ایسی بات جنم لے جس کی نظیر شروع میں موجود نہ ہو۔ ریلف لنٹن (RALPH LINTON) نے دی سٹڈی آف مین (THE STUDY OF MAN) میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

البتہ نظائر کی تلاش کے لیے یہ ضروری ہے کہ قرنِ اوّل کا اصولی ریکارڈ (FUDAMENTALS) نہیں بلکہ من وعن ریکارڈ (CONCRETE RECORD) سامنے موجود ہو۔ علامہ اقبال نے تشکیل جدید الہیات اسلامیہ (RECONSTRUCTION OF RELIGIOS THOUGHT IN ISLAM) میں لکھا ہے کہ محدثین نے اسلام کے ابتدائی زمانے کے من وعن (CONCRETE) کا تصور محفوظ کر کے نہایت ہی گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ وحی ختم کر دینے میں بھی یہی حکمت ہے کیونکہ جو معاشرہ آپ کی رہنمائی میں قائم ہوا اس میں عمرانی، معاشی، سیاسی شعبہ ہائے حیات مکمل طور پر قائم ہو چکے تھے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قائم کیے ہوئے معاشرے کا مکمل نقشہ محفوظ ہے تو آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے وہ ہر لحاظ سے جامع اور مکمل ہوگا لہذا آسمانی ہدایت کی اب مزید ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

چونکہ ہر سوال کا جواب ہمیشہ کے لیے موجود ہونے کے لیے ضروری تھا کہ ہدایت واضح صورت (CONCRETE FORM) میں محفوظ ہوتی اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید وقتاً فوقتاً موقع ومحل کے

لحاظ سے نازل فرمایا تاکہ نزول اور شانِ نزول سے نئے والے موقع کے لیے راہنمائی کا سبب بن سکیں۔ ملا علی قاری نے مرآۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح میں لکھا ہے کہ قرآنِ پاک کا اپنے بارے میں جو تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (کہ اس میں ہر چیز کا بیان موجود ہے) کا دعویٰ ہے یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اجتہادات تمام کے تمام قرآن کی روشنی میں ہوتے تھے اور قرآنی احکام کے منشاء و مفہوم کی تعیین آپ کے عمل ہی سے متعین ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اللہ کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت دونوں مل کر ہر بات کے جواب، ہر مشکل کے حل اور ہر گمراہی کے لیے ہدایت کا ہر عہد اور ہر جگہ کے لیے ہر لحاظ سے کامل اور جامع سرمایہ مہیا کرتے ہیں۔

قرآن سے استدلال قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر بالوضاحت موجود ہے کہ اللہ کی شریعت ہر لحاظ سے مکمل اور جامع ہے اور انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے لیے یہ ہدایت مہیا نہ کرتی ہو۔ ہم صرف چند دلائل پر اکتفا کریں گے۔

ا- أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ۔ " اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے صاحبانِ حکم کی بھی۔ اور اگر تمہارے مابین کسی بات پر نزاع واقع ہو جائے تو اُسے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی طرف لوٹاؤ۔"

یہاں اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اولوالامر بذاتِ خود اطاعت کے مستحق نہیں ہیں بلکہ اُن اُمور میں اُن کی اطاعت کی جائے گی جو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق ہوں۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ واجب الاطاعت ہرگز نہیں۔ پھر آگے فرمایا گیا ہے فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ۔ اور اگر تم میں اور اولوالامر میں کسی بات پر اختلاف پیدا ہو جائے تو اُس کا حکم اللہ اور اُس کے رسول کے احکام کی روشنی میں تلاش کرو۔ یہ خطاب ہر عہد اور ہر جگہ کے مسلمانوں کو ہے اور اس میں اس بات کا دعویٰ ہے کہ جس بات سے متعلق بھی اختلاف رونما ہو گا اُس کے بارے میں شریعت میں حکم موجود ہو گا، ورنہ اللہ اور رسول کی طرف لوٹانے کا حکم بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

ب- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً "اے ایمان والو اسلام میں مکمل طور پر داخل ہو جاؤ۔"

اس آیت سے ہم پر یہ واضح ہوتا ہے کہ ہر عہد اور ہر جگہ کے مسلمانوں کی زندگی پر اسلام مکمل طور پر محیط ہے۔ کیونکہ داخل اُسی چیز میں ہوا جا سکتا ہے جو احاطہ کر لینے کی صلاحیت رکھتی ہو، اور مکمل طور پر اُسی چیز میں داخل ہوا جا سکتا ہے جو مکمل طور پر گھیر سکتی ہو۔ لہذا یہ بات قرآن کریم کی رُو سے بالکل باطل ہے کہ شریعت ہمہ گیر نہیں اور بعض معاملات میں خاموش ہے۔ بلکہ قرآن مجید تو اس پر زور دے رہا ہے کہ یہ جملہ امور پر محیط ہے۔

ج۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ "اے نبیؐ، تمہارے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک وہ آپؐ کو اپنے ہر تنازعہ میں اپنا حکم نہ بنائیں اور پھر جو فیصلہ آپؐ کریں اس کے بارے میں اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور تسلیم کر لیں جیسے تسلیم کرنے کا حق ہوتا ہے"۔

اس آیت سے بظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بات بھی جو مُتنازع فیہ ہو اُس میں آپؐ کو حکم بنایا جا سکتا ہے، ورنہ آپؐ پر فیصلہ چھوڑنے کا حکم دینا ہی غلط ہے۔ اور پھر آپؐ کے ارشادات کے آگے مکمل طور پر سرِ تسلیم خم کر دینے کے حکم نے خود بینی و آزادی کی ذرّہ برابر بھی گنجائش نہیں چھوڑی۔ ایک مسلمان اسلام میں داخل ہونے سے پہلے تو اپنی رائے اور عقل استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن جب وہ اسلام کے شہر میں داخل ہو جائے تو پھر ذاتی رائے اور آزادی کی گٹھڑی دروازے پر ہی رکھ جائے، ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں، اسے ہر معاملے میں حکمِ شریعت معلوم کر کے اُس پر چلنا ہوگا:

آزمودم عقلِ دُور اندیش را
بعد ازیں مستانہ سازم خویش را

د۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ "تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں عمدہ نمونہ موجود ہے"۔

یہاں بھی ہر عہد اور ہر جگہ کے لوگوں کو ارشاد ہے تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ کی زندگی ایک کامل نمونہ ہے۔ صرف یہی نہیں کہا کہ نمونہ ہے بلکہ ساتھ "حسنۃ" بھی فرمایا ہے اور حسن کے لیے ضروری ہے کہ کامل ہو، کیونکہ ناقص حسین نہیں ہو سکتا۔ حسن کے لیے ضروری ہے کہ ہر کمی اور عیب سے پاک ہو۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہر انسان کے لیے مکمل نمونہ ہے۔ یہ ہرگز نہیں کہ بعض معاملات میں نمونہ ہے اور بعض میں نہیں۔

۳ - أَمْ لَهُمْ شُرَكَٰٓؤُاْ شَرَعُواْ لَهُم مِّنَ ٱلدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنۢ بِهِ ٱللَّهُ "کیا ٹھہرا لیے ہیں انہوں نے شریک جنہوں نے اُن کے لیے ایسی شریعت سازی کی ہو جس کا اللہ نے کوئی اذن نہیں دیا"

اس آیت میں شریعت سازی کو شرک قرار دیا گیا ہے جو سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ شریعت کسی گوشہ سے متعلق بھی خاموش نہ ہو۔ کیونکہ اگر شریعت میں حکم موجود نہ ہو گا تو انسان خود بنائیں گے اور شرک میں مبتلا ہو جائیں گے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ شریعت جس کا اوّلین مقصد توحید کی دعوت اور شرک کا قلع قمع ہو وہ خود ہی شرک کے لیے گنجائش پیدا کر دے۔

حدیث سے استدلال ۱ - من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فھو رد (بخاری و مسلم) جس نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہماری طرف سے ثبوت موجود نہیں ہے تو وہ مردود ہے"۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی نے ایسے وہم و گمان کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی کہ کوئی ایسا امر بھی ہو سکتا ہے جس پر شریعت کا حکم موجود نہ ہو۔ کیونکہ جو کام بھی دلیل شرعی کے بغیر کیا جائے گا غلط اور غیر مقبول ہو گا۔

قال القاضی: المعنی من احدث فی الاسلام رأیا لم یکن له من الکتاب و السنة سند ظاهر او خفی، ملفوظ او مستنبط فهو مردود علیه - من عمل عملاً، ای من ای شیء من الطاعات او بشیء من الاعمال الدنیویة و الاخرویة، سواء کان محدثاً او سابقا علی الامر، لیس علیه امرنا، ای وکان من صفته انه لیس علیه امرنا بل اتی به علی حسب هواه، فهو رد، ای مردود غیر مقبول - فهذه الروایة اعم وهذا الحدیث عماد فی التمسك بالعروة الوثقی او اصل فی الاعتصام بحبل الله الاعلی، و رد للمحدثات و البدع و الهوی - (مرقاة شرح مشکوة ج ۱ ص ۲۱۵)

والاتباع کما یکون فی الفعل یکون فی الترك - فمن واظب علی ما لم یفعل الشارع صلی الله علیه وسلم فهو مبتدع لشمول قوله صلی الله علیه وسلم من عمل عملاً لیس علیه امرنا فهو رد (مواهب لطیفه شرح مسند ابی حنیفه بحث تلفظ بالنیة)

" اتباع جیسے فعل میں ہے اسی طرح ترک میں بھی ہے سو جس نے ایک فعل پر مواظبت کی جو شارع نے نہیں کیا تو وہ مبتدع ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جس نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہمارا

امر نہیں تو وہ مردود ہوگا"۔

اور علامہ سید جمال الدین فرماتے ہیں؛

ترکہ صلی اللہ علیہ وسلم سنۃ کما ان فعلہ سنتہ (الجنۃ لاصحاب السنۃ ص ۱۴۳)

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی چیز اور کام کو ترک کرنا بھی سنت ہے جیسا کہ آپ کا فعل سنت ہے"۔

مخالف و مطابق کی تفریق یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جن باتوں سے شریعت کے کسی حکم کی مخالفت لازم نہ آتی ہو ان کے متعلق یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ جائز ہیں۔ یہ نظریہ بھی اسی مفروضے پر مبنی ہے کہ بعض معاملات کے بارے میں شریعت کے احکام موجود ہیں اور بعض کے بارے میں موجود نہیں، جو سراسر گمراہی ہے۔ کہنا دراصل یوں چاہیے کہ ہر وہ عمل جو شریعت کے احکام کے مطابق نہیں مردود ہے۔ مذکورہ بالا حدیث کے الفاظ جو سنن ابوداؤد میں مذکور ہیں وہ اس خیال کی بالکل جڑ ہی کاٹ دیتے ہیں: من صنع امراً علی غیر امرنا فھو رد۔ یعنی جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کی وجہ جواز شریعت کے علاوہ کوئی اور دلیل ہو وہ مردود ہے"۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کی اجازت بالکل نہیں کہ اپنی رائے اور خواہش کے مطابق قدم اٹھانے سے پہلے صرف اس قدر اطمینان ہی کافی ہے کہ کوئی واضح نہی موجود نہیں، ایسا کرنا ہوا و ہوس کے دروازے کو کھولنا ہوگا، اور اسلام جس سپردگی کا تقاضا کرتا ہے اُس سے رُوگردانی کا موجب ہوگا۔ کسی واضح نہی کی عدم موجودگی میں بھی ہر قدم اُٹھانے سے بیشتر شریعت سے اجازت طلب کرنا ہوگی اور شریعت کے علاوہ کوئی بیرونی جذبہ اگر کسی فعل پر آمادہ کرے تو اُس سے اجتناب کرنا ہوگا۔ شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفا میں دارمی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ فاروق اپنے عمّال کو ہدایت کیا کرتے تھے کہ ہر بات کو پہلے اللہ کی کتاب میں تلاش کرو اگر وہاں اُس کی صراحت نہ ملے تو سنّتِ نبوی میں تلاش کرو اور اگر وہاں سے نہ تو کوئی صراحت ملے اور نہ کوئی دلالت ملے تو اس کام سے توقف کرو۔

ب۔ یاایھا الناس انی قد ترکت فیکم ما ان اعتصمتم بہ فلن تضلوا ابداً کتاب اللہ وسنۃ نبیہ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ (مستدرک حاکم) "اے لوگو میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑی ہیں اگر تم نے ان کو مضبوطی سے پکڑا تو تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ ان میں سے ایک کتاب اللہ، اور دوسری سنّت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)"

یعنی اگر کتاب و سنّت کو مضبوطی سے پکڑے رکھو تو گمراہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حدیث میں

ضلالت کے الفاظ استعمال نہیں ہوتے۔ ضلالت کے معنی اصل راستے کے علاوہ کسی دوسرے راستے پر چلنے کے نہیں ہوتے بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اصل راستے کا واضح علم موجود نہیں لیکن اس کی تلاش ہے۔ قرآن مجید میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آتا ہے وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى کہ پایا آپؐ کو صحیح راستے کا متلاشی پس وہ آپؐ کو بتلا دیا۔ تو حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ کتاب وسنّت کی موجودگی میں یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی وقت ایسا آجائے یا کوئی صورت حال ایسی پیش آجائے جس کے بارے میں واضح ہدایت موجود نہ ہو کیونکہ واضح ہدایت کی عدم موجودگی کا دوسرا نام ضلالت ہے۔ پس شریعت بنی نوع انسان کے لیے اس قدر محیط ہے کہ اُن کو زندگی کے ہر موڑ پر رستہ دکھاتی ہے۔ صحابہ کرامؓ یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ اسی لیے تو کفار اُن کو ازراہ تمسخر کہا کرتے تھے کہ تمہارا پیغمبر تمہیں پیشاب وغیرہ کرنے کا طریقہ بھی بتاتا ہے؟ صحابہ کرامؓ کہتے: ہاں، بالکل۔

أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاكُمْ کا مطلب

بعض لوگ دینی اور دنیوی امور کی گمراہ کن تعریف کرتے ہیں۔ حالانکہ کوئی بھی فعل ہو اس کے بارے میں شریعت میں حکم موجود ہوگا کہ یہ جائز ہے یا ناجائز۔ انسانی افعال و اعمال کی یہ تقسیم کہ کچھ دینی ہوتے ہیں اور کچھ دنیاوی ایک مہمل اور بے سروپا تقسیم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسولؐ کی اطاعت و اتباع کو اس طرح بالکل تقسیم نہیں کیا اور جہاں جہاں اس کا حکم دیا ہے بالکل مطلق اور غیر مقید ہے اور کہیں اس تقسیم کی اجازت نہیں دی۔ اللہ کے رسولؐ ہر وقت اور ہر حالت میں اللہ کے رسولؐ تھے۔ یہ نہیں کہ رسالت اور نبوت ایک کیفیت اور حالت تھی جو اُن پر طاری ہوتی تھی اور اس کے بعد وہ رسول نہیں رہتے تھے۔ بلکہ رسالت ان کی ایک صفت تھی جس سے وہ ہر وقت متصف رہتے تھے۔ چلتے پھرتے، میدانِ جنگ میں اور اپنے گھر میں، ہر حالت میں وہ اللہ کے رسول تھے، واجب الاتباع تھے، اور اُن کا ہر فعل اور ہر قول اُمت کے لیے نمونہ ہے۔ سورۃ احزاب میں ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا "کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق نہیں کہ اللہ اور اس کا رسولؐ جب کسی بات کا فیصلہ کر دے تو اس کے لیے اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے۔ جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا"۔

اب اس آیت میں سب امور میں اطاعت کا حکم دیا گیا ہے یہ نہیں کہا گیا کہ فلاں قسم کے امور میں اطاعت ضروری ہے اور فلاں قسم کے اُمور اس سے مستثنیٰ ہیں۔

صحابہ کرامؓ کے عمل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ہاں ایسی کسی قسم کی تقسیم کا وجود نہیں تھا۔ وہ آپؐ کے ہر حکم کو واجب الاطاعت سمجھتے تھے خواہ وہ زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھتا ہو۔

ہاں بعض معاملات ایسے ہیں جن میں ہمیں غور و فکر کرنے اور اپنی آزادی استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ لیکن ہم بذاتِ خود اس کے حدود متعین کرنے کے مجاز نہیں ہیں بلکہ اس فرق کو معلوم کرنے کا ذریعہ بھی یا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی تصریح ہو سکتی ہے یا پھر وہ اصولِ شریعت جو آپ کی دی ہوئی تعلیمات سے مستنبط ہوں۔

مثلاً بریرہؓ ایک لونڈی تھیں، جب وہ آزاد ہوئیں تو جیسا کہ آزاد ہونے پر ہر غلام اور لونڈی کو اختیار رہوتا ہے کہ وہ نکاحِ سابق کو برقرار رکھے یا توڑ دے تو انہوں نے اپنے اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے اپنے خاوند قیس سے نکاح ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ قیس ان کے پیچھے پیچھے روتا ہوا بھاگ رہا تھا کہ دونوں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے۔ آپؐ نے بریرہؓ سے قیس کے پاس لوٹ جانے کو کہا تو بریرہؓ نے پوچھا کہ یہ آپؐ کا حکم ہے یا محض سفارش؟ آپؐ نے فرمایا حکم نہیں ہے۔ تب بریرہؓ نے اپنا اختیار استعمال کیا۔ یہاں بریرہؓ کو اگرچہ آپؐ کا ارشاد آپ کی تعلیمات سے ہٹ کر نظر آیا پھر بھی اُنہوں نے اس بات کی وضاحت آپؐ ہی سے کرا لی کہ کہیں یہ حکم تو نہیں۔ یہ نہیں کیا کہ از خود ہی امتیاز قائم کر لیا ہو۔ اور جو اختیار انہوں نے استعمال کیا وہ آپؐ ہی کا دیا ہوا تھا۔ اسی طرح جنگِ بدر کے موقع پر آپؐ نے ایک جگہ خیمہ نصب کیا تو حضرت حباب بن المنذرؓ کو جنگی تدبیر کے اعتبار سے ذہن میں اختلاف پیدا ہوا۔ اس لیے پہلے انہوں نے آپؐ سے دریافت کر لیا کہ آپؐ کا یہ اقدام وحی کی روشنی میں ہے یا محض ایک تدبیرِ جنگ؟ بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی یہ فرما دیا کرتے تھے کہ فلاں بات آپ ایک دینی حکم کے طور پر نہیں فرما رہے بلکہ محض ایک ذاتی مشورہ دے رہے ہیں جیسا کہ تابیرِ نخل کے معاملہ میں آپؐ نے فرما دیا:

انما انا بشر، اذا امرتکم بشیٔ من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم من رایی فانما انا بشر۔ انما بہ ظننت ظنا فلا تؤاخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم من اللہ شیئاً فخذوا بہ فانی لم اکذب علی اللہ ـــ انتم اعلم بامر دنیاکم۔ (صحیح مسلم) "میں بھی ایک انسان ہوں۔ جب میں تم کو تمہارے دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اسے مانو اور جب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں تو بس میں بھی ایک انسان ہی ہوں۔ میں نے اندازاً ایک بات کہی تھی۔ تم میری ان باتوں کو نہ لو جو گمان اور رائے پر مبنی ہوں۔ ہاں جب میں خدا کی طرف سے کچھ بیان کروں تو اسے لے لو۔ اس لیے کہ میں نے خدا پر کبھی جھوٹ نہیں باندھا۔ تمہیں اپنے دنیوی معاملات کا زیادہ علم ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تابیر نخل (کھجور کا پیوند) لگانے کے متعلق کچھ لوگوں نے سوال کیا۔ آپ نے اُن کو اس فعل سے روکا جس کے نتیجے میں اس سال پھل نہیں آئے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صورتِ حال کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا تم اپنے دُنیاوی معاملات سے زیادہ واقف ہو۔

واقعات (FACTS) کا مشاہدہ کرنا اور اُس مشاہدہ سے معلومات حاصل کرکے اُن کے واقعات میں علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کے رشتے دریافت کرنا اور چیز ہے، اور کسی فعل کے بارے میں جائز یا ناجائز ہونے کا حکم لگانا اور ہے۔ پہلی قسم کے اُمور سائنس کا میدان ہیں اور تجربات کہلاتے ہیں۔ اور دوسری قسم کے امور مذہب کا میدان ہیں اور شرعیات کہلاتے ہیں۔ تابیرِ نخل کا واقعہ تجربات سے متعلق تھا اور آپ کے ارشاد کے بموجب اس کا منصبِ رسالت سے تعلق نہ تھا، البتہ شرعیات (دین) میں آپ کا فرمان ماننا واجب ہے۔

"معاملات میں دو مرتبے ہیں۔ ایک تو تجربیات کہ فلاں کام کیوں کر کریں کہ نفع ہو، زراعت کیونکر کریں کہ غلہ پیدا ہو۔ کھیت کیونکر بونا چاہیے اور تخم ڈالنا کس وقت مناسب ہے کہ فصل اچھی ہو۔ یہ تو تجربیات ہیں۔ دوسرے شرعیات کہ فلاں صورت سے تجارت کرنے میں ربا ہوگا وہ حرام ہے، فلاں صورت میں جائز، یعنی احکام حلت و حرمت، گو امور دنیوی ہی سے متعلق ہوں، یہ مسائل ہیں اور شریعت سے ثابت ہیں، اور تابیر تجربیات سے ہے۔" (مولانا اشرف علی تھانوی: دعوات عبدیت)

پروفیسر ابوزہرہ بیمہ کے متعلق اپنی فاضلانہ تحقیق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ معاملہ اُمورِ دنیا سے تعلق رکھتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے انتم اعلم بامور دنیاکم (تم اپنے دنیوی اُمور کو بہتر جانتے ہو) اس سلسلہ میں اس حدیث سے سند پکڑنا ایسے ہی لوگوں کا کام ہوسکتا ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ دین کے احکام کو صرف عبادات کے مخصوص دائرہ تک محدود رکھ کر باقی جتنے فقہی احکام ہیں ان کو حلال و جائز قرار دے دیا جائے۔

اس حدیث کی حقیقی نوعیت کی وضاحت کے لیے عرض ہے کہ اس حدیث کا انطباق عام تشریعی اُمور کو چھوڑ کر صناعت، زراعت اور تجارت کے (تجربی) اُمور پر کیا جائے گا۔ اس حدیث کے پیچھے پڑے رہنے والوں کے لیے مفید ہوگا کہ اس حدیث کے ساتھ ان احادیث کو شمار اور مطالعہ بھی کریں جو معاملات اور اسٹیٹ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور جن پر ایسی صورت میں عمل ہوسکتا ہے جب کہ اس حدیث کو زراعت

صناعت یا ایسے ہی دوسرے عام یا روزمرّہ کے تجربی اُمور تک محدود رکھا جائے۔" (مجلہ "برہان" دہلی مارچ ۶۰ء)

امام مسلمؒ نے تابیر نخل کی روایت پر جو باب باندھا ہے اُس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"کتاب الفضائل باب وجوب امتثال ما قاله شرعًا دون ما ذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم من معایش الدنیا علی سبیل الرأی"

امام مسلمؒ کے "من معایش الدنیا علی سبیل الرأی" کہنے سے اس بات پر مزید روشنی پڑتی ہے کہ تجربات کے بارے میں آپؐ کا فرمان دو قسم کا ہوسکتا تھا۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بذریعہ وحی مطلع کرے۔ دوسرے یہ کہ آپؐ محض اپنا ذاتی اندازہ ذکر فرما رہے ہوں۔ اسی لیے حضرت حباب بن المنذرؓ نے آپؐ کی جنگی تدبیر کے اندازہ کو مزید معلومات بہم پہنچانے سے پہلے دریافت کرلیا کہ کہیں آپؐ کا اندازہ وحی پر مبنی تو نہیں۔ مگر صلح حدیبیہ ایک جنگی تدبیر تھی جو آپؐ نے وحی کی روشنی میں اختیار فرمائی تھی۔

کسی صورتِ حال کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے اُس کے بارے میں تمام تفصیلات اور جزئیات کا معلوم ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ان تفصیلات و جزئیات کو بہم پہنچانے کے لیے ہی آپؐ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کرتے تھے تاکہ صورتِ حال کے مطابق قدم اُٹھایا جاسکے، اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے شہادت طلب کیا کرتے تھے تاکہ صحیح حالات سامنے آسکیں۔ ان معاملات میں آپؐ کی معلومات اگر وحی پر مبنی نہ ہوتیں تو آپؐ کو مزید معلومات بہم پہنچا کر آپؐ کے اندازہ کو بدلا بھی جاسکتا تھا۔

اور حقائق کے بارے میں تفصیلات اور جزئیات کا علم فراہم کرنا تجربیات کا ایک حصّہ ہے اور سائنس کا جزو لاینفک۔ اس کے بعد ہی دو یا زیادہ حقائق (FACTS) کے مابین علت و معلول کا رشتہ دریافت کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً دو حصّے ہائیڈروجن اور ایک حصّہ آکسیجن گیس ملانے سے پانی بن جاتا ہے۔ لیکن پانی کب طاہر، مطہر یا طہور ہوتا ہے یہ شریعت کا حصّہ ہے۔

۷۔ فان خیر الحدیث کتاب اللہ وخیر الھدی ھدی محمد صلی اللہ علیہ وسلم وشر الامور محدثاتھا وکل بدعۃ ضلالۃ (مسلم)۔ "بہترین بیان اللہ کی کتاب ہے اور بہترین نمونہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے اور وہ کام بُرے ہیں جو نئے گھڑ لیے گئے ہوں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

ہر وہ کام جس کی نظیر یا دلیل اللہ کی کتاب یا سنّت رسولؐ میں موجود نہیں بدعت ہے اور اس حدیث کی رو سے ہر بدعت گمراہی ہے، لہٰذا دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو کوئی بات کتاب و سنّت پر مبنی ہوگی اور اگر

ایسا نہیں ہے تو پھر بدعت ہوگی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمادی ہے محمود اور مقصود فعل صرف وہی ہوسکتا ہے جس پر شریعت کی کوئی دلیل قائم ہو ورنہ وہ بدعت شمار ہوگا جو کہ گناہِ عظیم ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابی اللہ ان یقبل عمل صاحب بدعۃ حتی یدع بدعتہ (ابن ماجہ) "آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بدعتی کے عمل کو قبول کرنے سے انکار کردیا ہے تا وقتیکہ وہ بدعت کو ترک نہ کردے"۔

بدعت کے معنی علامہ مرتضیٰ الزبیدی لکھتے ہیں:

کل محدثۃ بدعۃ انما یرید ما خالف اصول الشریعۃ ولم یوافق السنۃ (تاج العروس جلد ۵ ص ۲۷۱) "کل محدثۃ بدعۃ کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز اصول شریعت کے خلاف ہو اور سنت کے موافق نہ ہو"۔

حافظ ابن رجب لکھتے ہیں:

والمراد بالبدعۃ ما احدث مما لا اصل لہ فی الشریعۃ یدل علیہ واما ما کان لہ اصل من الشرع یدل علیہ فلیس ببدعۃ شرعاً وان کان بدعۃ لغۃ (جامع العلوم والحکم ص ۱۹۳) "بدعت سے مراد وہ چیز ہے جس کی شریعت میں کوئی اصل نہ ہو جو اُس پر دلالت کرے۔ اور بہر حال وہ چیز جس کی شریعت میں کوئی اصل ہو جو اُس پر دال ہے تو وہ شرعاً بدعت نہیں ہے اگرچہ "لغتہً" "بدعت ہوگی"۔

لہٰذا ہر فعل خواہ وہ کسی بھی شعبۂ زندگی سے تعلق رکھتا ہو۔ اگر وہ بعینہٖ سنتِ رسولؐ میں نہیں پایا جاتا اور نہ شریعت میں اُس کی دلیل موجود ہے وہ بدعت ہے۔

بدعت حسنہ و سیئہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر کسی فعل یا ترکِ فعل کی نہ تو کتاب و سنت میں بعینہٖ نظیر موجود ہو اور نہ اُس پر کوئی دلیل مذکور ہو وہ بدعت اور گمراہی ہے۔ لیکن اگر ایک فعل کی بعینہٖ نظیر سنتِ رسولؐ میں موجود نہیں مگر اس پر کوئی دلیل دلالت کرتی ہو تو اُس کو بعض علماء "سنت" کہنے کے بجائے "بدعت حسنہ" کہہ دیتے ہیں۔ یہ تقسیم اُن کے ہاں روا ہے جو سنت کی دو قسمیں کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ کتاب و سنت میں اُس کی نظیر ملے اور دوسری یہ کہ اُس کی نظیر تو میسر نہ آسکے مگر اُس کی دلیل ملتی ہو۔ اور جو سنت کی یہ تقسیم نہیں کرتے اُن کے ہاں سنت کی تعریف وہ فعل ہے جس کی دلیل کتاب و سنت میں ملتی ہو۔ یہ لوگ بدعت کی مذکورہ بالا

تقسیم کے بھی خلاف ہیں اور ان کے نزدیک ہر بدعت ضلالت وگمراہی ہے۔

حافظ ابن حجر تقسیم کے قائل ہیں اور کہتے ہیں:

والتحقیق انما ان کانت مما تندرج تحت مستحسن فی الشرع فھی حسنۃ وان کان مما تندرج تحت مستقبح فی الشرع فھی مستقبحۃ (فتح الباری ج ۴ ص ۲۱۹) "تحقیق یہ ہے کہ اگر بدعت شریعت کی کسی پسندیدہ دلیل کے تحت داخل ہو تو وہ بدعت حسنہ ہوگی اور اگر وہ شریعت کی کسی غیر پسندیدہ دلیل کے تحت داخل ہو تو وہ بدعت قبیحہ ہوگی۔"

قائلینِ تقسیم کے سامنے غالباً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مثال ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں لوگ مسجد میں ایک سے زیادہ جماعتوں کی صورت میں نماز تراویح ادا کیا کرتے تھے۔ انہوں نے سب کو ایک قاری پر جمع کر دیا تاکہ ایک وقت میں ایک مسجد میں ایک ہی جماعت ہو اس کو انہوں نے نعم البدعۃ ہذا کہا ہے کہ یہ ایک اچھی بدعت ہے کیونکہ نماز تراویح ایک ہی جماعت کے ساتھ پڑھنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور بخاری شریف میں آتا ہے۔ حضرت عمرؓ کا یہ اقدام کسی دلیل شرعی کے بغیر ہرگز نہیں تھا۔ محمد بن نصر مروزی نے کتاب اللیل میں یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے:

ان کانت ھذہ البدعۃ فنعمت بدعۃ ھذہ "اگر یہ امر بدعت ہے تو ایک اچھی بدعت ہے"

حضرت مجدد الف ثانیؒ اور امام مالکؒ تقسیم کے قائل نہیں۔ وہ فرماتے ہیں: "چیزے کہ مردود باشد حسن از کجا پیدا کند"۔ (مکتوبات حصہ سوم ص ۴۲) "جو چیز مردود ہو اس میں حسن کہاں سے آجائے گا۔"

اور امام مالکؒ ارشاد فرماتے ہیں:

من ابتدع فی الاسلام بدعۃً یراھا حسنۃ فقد زعم ان محمداً صلی اللہ علیہ وسلم خان الرسالۃ لان اللہ تعالی یقول الیوم اکملت لکم دینکم (الایۃ) فما لم یکن یومئذٍ دیناً فلا یکون الیوم دیناً (الاعتصام للشاطبی ج ۱ ص ۴۷) "جس نے اسلام میں کوئی بدعت نکالی جس کو وہ حسنہ سمجھتا ہے تو گویا اس نے یہ گمان کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ادائیگی رسالت میں خیانت کی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔ پس جو چیز اس وقت دین نہ تھی وہ آج بھی ہرگز نہیں ہو سکتی۔"

بدعت کے معاملہ میں شرعیات اور تجربیات کے مابین کوئی واضح خطِ امتیاز نہیں کھینچا جا سکتا۔ تجربیات

میں مختلف اشیاء و واقعات (FACTS AND THINGS) کے متعلق جزوی و تفصیلی معلومات حاصل کی جاتی ہیں، یا پھر اُن اشیاء و واقعات کے آپس میں علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کے رشتے دریافت کیے جاتے ہیں۔ یہ سائنس اور اُن علوم کی دنیا ہے جو مقاصدِ شریعت میں سے نہیں۔

مثلاً فزکس اور کیمسٹری میں یہ معلوم کرتے ہیں کہ جب کوئی ٹھوس چیز گیس میں تبدیل ہوتی ہے تو حجم میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس رشتے اور اصول کو معلوم کرنے کے بعد وہ اسے بارود بنانے میں استعمال کرتے ہیں۔ علم زراعت میں یہ دریافت کرتے ہیں کہ پیوند کاری، بیج کی اقسام اور کھاد پیداوار پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ سوشیالوجی میں اس بات کا مطالعہ کرتے ہیں کہ صنعتی ترقی کا خاندانی رشتوں یا جرائم پر کیا اثر پڑتا ہے۔ لسانیات میں ایک زبان کو لکھنے اور بولنے میں جن قواعد کو ملحوظ رکھا جاتا ہے ان کو مرتب کیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ شریعت تجربیات میں اس طرح دخل دیتی ہے۔ کبھی وہ واجب ہیں تو کبھی حرام، کبھی مندوب ہیں تو کبھی مکروہ۔ تجربیات میں جو نئی نئی ایجادات و انکشافات ہوتے ہیں اُن کو بدعت شمار کرکے امام نووی نے شرح مسلم میں، ابن امیر الحاج نے مدخل میں اور عزیز الدین بن عبد السلام نے کتاب القواعد میں ان کا واجب، حرام، مندوب، مکروہ اور مباح ہونا تجویز کیا ہے۔

صرف یہی وہ اُمور ہیں جہاں حالات اور نیت کے مطابق حکم بدل جاتا ہے مثلاً کائنات کے اسرار کا کھوج لگانا واجب ہے۔ اس سے کسی وقت شریعت کے غلبہ اور کفر کے خاتمے کے لیے کام لیا جا سکتا ہے۔ اور بارود اس لیے تیار کرنا کہ کفار کے خلاف جنگ میں استعمال کیا جائے فرض کفایہ ہے لیکن کسی کو ناحق قتل کرنے کے لیے حرام ہے۔

تجربیات جب تک صرف معلومات کی حد تک ہوں تو شریعت کے دائرہ سے باہر ہیں لیکن جونہی وہ فعال کی صورت اختیار کرتی ہیں شریعت کے حدود میں داخل ہو جاتی ہیں۔

سنّت خلفاء راشدین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہدایت یافتہ خلفاء الراشدین کی اقتداء کا حکم دیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ خلفاء الراشدین اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق چل سکتے ہیں۔ وہ بھی دیگر افراد اُمّت کی طرح کتاب وسنّت کی دلیل کے پابند ہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد جو پہلا خطبہ ارشاد فرمایا تھا اُس میں انہوں نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ میرا جو حکم کتاب وسنّت کے مطابق ہو تم اُس میں میری اطاعت کرو اور جو حکم کتاب وسنّت کے موافق نہ ہو اُس کا تمہارے لیے ماننا

ضروری نہیں۔

ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی پیروی کرنے کا اسی لیے ارشاد ہوا ہے کہ وہ کتاب وسنّت کے بتلائے ہوئے راستے پر گامزن ہوتے ہیں۔ ملا علی قاری لکھتے ہیں،

فانهم لم يعملوا إلا بسنتي فالاضافة اليهم إما بعملهم بها أو لاستنباطهم و اختيارهم اياها (مرقات شرح مشكوة ج ۲ ص ۳۰) "اس لیے کہ خلفاء راشدین نے درحقیقت آپ ہی کی سنت پر عمل کیا ہے اور ان کی طرف سنت کی نسبت یا تو اس لیے ہوئی کہ انہوں نے اس پر عمل کیا یا اس لیے کہ انہوں نے خود قیاس واستنباط کرکے اس کو اختیار کیا۔"

من سن سنة حسنة

حدیث میں آتا ہے،

من سن في الاسلام سنة حسنة فعمل بها بعده كتب له مثل اجر من عمل بها ولا ينقص من اجورهم شيء (مسلم) "جس نے جاری کیا اسلام میں طریقہ نیک پھر اس کے بعد اس طریقہ حسنہ پر عمل کیا گیا تو اس شخص کے واسطے اس قدر اجر و ثواب لکھا جائے گا جس قدر اس پر عمل کرنے والوں کو اس کے بعد ہوگا اور ان لوگوں کے ثواب میں کچھ کمی نہیں کی جائے گی۔"

اس روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام میں کوئی نوایجاد چیز مستحسن ہوسکتی ہے۔ اُمت کا کام سنّت کی پیروی کرنا ہے اس کو جاری کرنا ہرگز نہیں۔ اس روایت میں من سن فی الاسلام کے بجائے یہ الفاظ بھی آتے ہیں۔ ایما داع دعا الی الهدی۔ "جس داعی نے ہدایت کی طرف دعوت دی" (مسلم ج ۲ ص ۳۴۱ ابن ماجہ ص ۱۹)۔ اور اس کے ایک اور طریق کے الفاظ ہیں: من احیا سنة من سنتي قد اميتت من بعدي (مشكوة شريف ج ۲ ص ۳۰) جس نے میری کسی ایسی سنّت کو زندہ کیا جو میرے بعد مُردہ ہو چکی تھی۔" اس روایت کے یہ سب طریقے مل کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ سنّت اور طریقہ کا جاری کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کی طرف دعوت دینا، اس کو زندہ کرنا اور خود اس پر عمل کرنا مراد ہے۔

د۔ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما احدث قوم بدعة الا رفع مثلها من السنة فتمسك بسنة خير من احداث بدعة (مسند احمد ج ۴ ص ۱۰۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی قوم بدعت ایجاد نہیں کرے گی مگر اس کی مقدار میں سنّت ان سے اُٹھالی جائے گی اس لیے سنّت کو مضبوطی سے پکڑنا بدعت کے ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔"

(دیکھیے صفحہ ۳۶)

جواب تنقید

از جناب قدیر الدین صاحب سابق چیف جسٹس ہائی کورٹ

(فروری اور مئی ۱۹۷۵ء کے ترجمان القرآن میں پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب نے اشارات میں جناب قدیر الدین صاحب کے ایک مضمون پر تنقید کی تھی۔ اس پر یہ جواب تنقید صاحب موصوف کی طرف سے وصول ہوا ہے۔ ان کے حق جواب کا اعتراف کرتے ہوئے یہ مضمون یہاں درج کیا جا رہا ہے۔ مگر آئندہ کے لیے اس بحث کو ختم سمجھا جائے)

"اپنے رب کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت سے بلاؤ اور لوگوں سے مباحثہ بہترین طریقہ سے کرو"

(قرآن۔ النحل ۱۶: ۱۲۵)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اس آیت کریمہ کی تفسیر تفہیم القرآن میں اس طرح فرماتے ہیں کہ:۔

"حکمت کا مطلب یہ ہے کہ..... حالات کو سمجھ کر اور موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے .... ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے ...... اس کی نوعیت محض مناظرہ بازی اور عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کی نہ ہو۔ اس میں کج بحثیاں اور الزام تراشیاں اور چوٹیں اور پھبتیاں نہ ہوں"۔

یہ تمہید میں نے اس وجہ سے کی ہے کہ میں نے ایک مقالہ "قرآنی نظریۂ ریاست" پر یہ سمجھ کر لکھا تھا کہ میں اچھا کام کر رہا ہوں۔ اس کی پانچ سو کاپیاں معارف لمیٹڈ پریس کے ایک حصہ دار نے اپنے خرچ پر چھپوائیں۔ اُن میں سے ڈھائی سو کاپیاں لاہور اور کراچی میں تقسیم ہوئیں اور باقی ابھی موجود ہیں۔ اُس مقالہ کی بنا پر میرا نام پہلی مرتبہ ترجمان القرآن جیسے مقتدر ماہنامہ میں آیا۔ مگر آیا تو اس طرح کہ چھوٹتے ہی عبدالحمید صدیقی صاحب ایڈیٹر ماہنامۂ مذکور نے میری نیت پر حملہ کر دیا۔ پہلے ہی پیراگراف میں ارشاد ہوا کہ:۔

"یہ مقالہ اعلیٰ طباعتی معیار کے ساتھ شائع ہوا ہے، اور آپ سے بعض روایات کے مطابق انتہائی سرگرمی کے ساتھ ایک خاص مقصد کے تحت پھیلایا جا رہا ہے"۔

کیا روایات؟ کس کی روایات؟ کونسا مقصد؟ کہاں پھیلایا جا رہا ہے؟ اگر کھول کر بیان کر دیتے تو پڑھنے والے

بھی کچھ اپنی رائے قائم کرسکتے اور مجھے بھی معلوم ہوجاتا کہ صدیقی صاحب کس گھر سے راز کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ بس طباعتی معیار کا ذکر کر کے کسی خفیہ روایات پر بات کو ختم کر دیا۔ یہ خیال نہ کیا کہ پڑھنے والے تو بد سے بد تر مقصد تصور کرلیں گے، ایسا گندہ مقصد کہ منہ پر لانے کے قابل نہیں۔ حالانکہ اس بدظنی کی کوئی اصلیت نہیں اور اس بے بنیاد تہمت کے ساتھ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا نام نامی بھی شامل ہے کیونکہ ہر پرچہ پر درج ہے۔ "مرتبہٗ ابوالاعلیٰ مودودی"۔

حیرت یہ ہے کہ صدیقی صاحب نے نہ سنجیدگی کو پسند فرمایا اور نہ پروفیسرانہ احتیاط کو ملحوظ رکھا بس اختلاف ہوا تو ٹوٹ پڑے۔ حالانکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمایا ہے کہ:

"(اے پیغمبرؐ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔"

آل عمران ۱۵۹ (تفہیم القرآن)

اگر مقصد تبلیغِ دین تھا تو اللہ کے اس حکم کا خیال ضرور کرتے۔ البتہ اگر غرض تکرار ہے تو اس زحمت کی ضرورت نہ تھی۔ صدیقی صاحب نے بیشک میرے لیے کوئی فحش لفظ تو استعمال نہیں کیا۔ مگر اس حد کے اندر رہ کر خوب خوب دشنام دہی سے کام لیا ہے۔ میں اُس سب سے قطع نظر کرتا ہوں۔ "بدم گفتی و خورسندم" کیونکہ میں خدا کی رحمت سے اور رسول اکرمؐ کی ہدایت سے مایوس نہ اپنے لیے ہوں اور نہ اُن کے لیے۔ میرا مقصد اسلام پر اعتراض نہیں مسلمانوں کے رہبروں کی توجہ حاصل کرنا ہے۔

صدیقی صاحب کو میرا مقصد معلوم کرنے کے لیے روایات میں "کھوٹنے" جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود عرض کر دوں کہ اگر میرے مقالے کی طباعت کا معیار بلند نہ ہوتا تو غالباً صدیقی صاحب توجہ نہ فرماتے، کیونکہ سب سے زیادہ جس چیز نے انہیں متاثر کیا وہ یہی معیار تھا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ اہل درد اور صاحب علم مسلمانوں کو بتاؤں کہ لوگ بھٹک رہے ہیں لیکن ان کی رہبری نہیں کی جا رہی۔ حکومت کے سامنے جو مسئلے درپیش ہیں ان کا حل نکالنا اور اس کو عملی صورت سے پیش کرنا اشد ضروری کام ہے۔ یہ کافی نہیں ہے کہ مسلمانوں کی ایسی چالیس حکومتوں کے اہل اقتدار کو، جن کا دائرہ آدھی دنیا کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے، یہ کہہ کر ٹھکرا دیا جائے کہ:-

" دشواریوں کا تذکرہ بعد کی باتیں ہیں۔ ایسے دانشوروں کو جنہیں اس بات پر شرح صدر حاصل نہیں

اگر کافرانہ نظام کو ہٹا کر اسلامی نظام کر دیا جائے تو اُمت مسلمہ کے اجتماعی مسائل بخوبی حل ہو سکیں گے پہلے اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے۔ کیونکہ ایمان تو نام ہی اس یقین کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اسلام کی صورت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے انسانیت کو جو ضابطۂ حیات عطا کیا ہے وہی انسانی مسائل کا صحیح حل اور انسانیت کے دکھوں کا حقیقی مداوا ہے۔ جن دانشوروں کو اس حقیقت میں شک ہے انہیں اسلام کے ساتھ اپنی وابستگی اور تعلقِ خاطر پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ قرآن مجید میں ایک مومن کی سب سے بڑی نشانی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ جب بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کا کوئی حکم سنتا ہے تو اس کے سامنے فوراً سرِ تسلیم خم کر لیتا ہے"۔

بس یہ سارے مسائل کا حل ہے جو صدیقی صاحب نے بتا دیا۔ یہ نہ سوچا اور نہ پوچھا کہ وہ مسائل ہیں کیا؟ لاؤ ہم حل کر کے بتا دیں۔ یہ نہیں کہ کوئی سوال نہیں پوچھے۔ سوال تو اُٹھائے۔ مگر ایسے کہ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گویا اسلام پر حملہ کیا گیا ہے۔ یہ خیال آیا ہی نہیں کہ ہم کر کیا رہے ہیں۔ صدیقی صاحب نے فرمایا کہ "دشواریوں کا تذکرہ بعد کی باتیں ہیں" اور یہ کہ "اسلامی نظام قائم کر دیا جائے تو اُمتِ مسلمہ کے اجتماعی مسائل بخوبی حل ہو سکیں گے"۔ اگر کوئی پوچھ لے کہ کس طرح؟ تو وہ اپنے ایمان کی خبر لے۔ اسی لیے تو میں نے عرض کیا تھا اور خود صدیقی صاحب نے اس کو فروری کے پرچہ کے صفحہ ۲۴۴ پر نقل بھی کیا ہے کہ:۔

"یہ لوگ (مسلمانوں کی چالیس حکومتوں کے اہل اقتدار) عملی انسان ہیں جنہیں مسائل کا سامنا کر کے ان کا حل تلاش کرنا ہے۔ وہ اپنے موجودہ طرزِ عمل کو اس وقت تک ترک نہیں کر سکتے جب تک کہ انہیں اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ اگر وہ (مبلغین کے) (نوٹ اسلام نہیں۔ یہاں ترجمہ میں غلطی ہوئی ہے۔ سارا پیرہ اہل علم کے متعلق ہے) تابع فرمان بن جائیں تو اجتماعی معاملات بخوبی طے ہوتے چلے جائیں گے۔ اگر ہم ان حضرات (اہل اقتدار) کو قائل یا ان کے اندازِ فکر کو تبدیل کرنے سے قاصر ہیں تو ان کمزور افراد کی تائید و حمایت سے کیا فائدہ جو نہ تو معاملات کی منصوبہ بندی کر سکتے ہیں اور نہ قوم کی سربراہی کا منصب سنبھال سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ لوگ ہماری قیمتی عددی قوت تو ہیں مگر یہ اہم مسائل کو منفی انداز میں حل کرنے کے عادی ہیں۔ اور یہیں تعمیری اندازِ فکر کی ضرورت ہے۔ یعنی اختصاصی علم اور دنیوی معاملات کا تجربہ"۔

اب فرمائیے کہ میں نے جو کچھ عرض کیا تھا وہ غلط تھا یا صحیح؟ میں نے جو کہا تھا وہ صدیقی صاحب نے کر کے دکھایا؟ اُن کو نہ تعمیری اندازِ فکر کی ضرورت کا خیال آیا، نہ اختصاصی علم کی حاجت کا، اور نہ دُنیاوی

تجربہ کا۔ اس پر بھی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ مندرجہ بالا تحریر کی بابت ارشاد کیا کہ (فروری صفحہ ۲۴۴) :-

"ہم یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ کہتے ہیں کہ گذشتہ سالوں میں نہ صرف ہمارا اخلاق بگڑا ہے بلکہ سوچنے سمجھنے کا معیار بھی کافی حد تک پست ہوا ہے۔ ملک کے ایک نامور صاحب علم لادینیت کے حق میں اس طرح کی بھونڈی دلیلیں پیش کر کے اپنے موقف کی صحت تسلیم کروانے پر مُصر نظر آتے ہیں۔ اگر ہم فاضل مقالہ نگار کی یہ بات تسلیم کر لیں کہ کسی چیز کا موجود ہونا ہی اس کے برحق ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے اور کسی چیز کی غیر موجودگی اس کے ناممکن العمل ہونے کی زبردست شہادت تو اس سے تو دنیا میں خیر اور بھلائی کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے۔"

صدیقی صاحب کے سوچنے سمجھنے کا جو معیار ہے وہ ہر ایک کو کہاں نصیب ہے۔ میری مندرجہ بالا عبارت کو پڑھیے اور دیکھیے کہ اس میں لادینیت کہاں ہے؟ اگر اہل اقتدار بات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو یہ لادینیت ہو گئی؟ اگر یہ کہا جائے کہ کوئی ان کو مطمئن نہیں کرتا تو یہ لادینیت کی طرفداری ہو گئی؟ اور بھونڈی دلیلیں ہو گئیں؟ بلکہ سمجھ کا پست معیار ہو گیا؟ صدیقی صاحب کے نزدیک ان کی ترش کلامی جائز ہے، کیونکہ وہ پہلے ہی مرض کی تشخیص کر چکے کہ یہ سب لوگ پہلے اپنے ایمان کی خبر لیں۔ اور اب گفتگو بے ایمانوں سے ہو رہی ہے۔ اب اس کی حاجت ہی نہیں کہ ہدایت کے وہ قطرے ٹپکائیں جن سے "جگر لالہ میں ٹھنڈک" پہنچے۔ اب تو وہ کڑک اور بجلی کا طوفان بنے ہوئے ہیں۔ سارے دانشور اب دشمنوں کی صف میں ہیں۔ وہ سب کو جلا کر راکھ کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح دین کی تبلیغ کی اور خدائے بزرگ و برتر نے اسی طریقہ ہدایت کا حکم فرمایا ہے؟ میں دو آیات کریمہ تو اوپر پیش کر چکا ہوں۔ اب وہ جانیں اور ان کا بے لگام قلم۔ میں تو پھر بھی یہ کہتا ہوں کہ اس میں صدیقی صاحب مجبور ہیں کیونکہ کام مشکل ہے اور ایسے وقت بحث میں خدا اور اس کے رسول کو بطور ڈھال کے استعمال کرنا آسان کام ہے۔ انہوں نے اس کام کو اور آسان اس طرح بنا لیا کہ مشکلات کو تسلیم ہی نہ کیا جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مشکلات درپیش ہیں۔ جو مشکلات راستہ میں حائل ہیں ان کی نشاندہی تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب خود ۱۹۴۸ء میں اُن تقریروں کے دوران فرما چکے ہیں جو انہوں نے لاء کالج لاہور میں کی تھیں۔ انہوں نے جدید تعلیم یافتہ اصحاب اور قدیم طرز تعلیم کی پیداوار دونوں کو موجودہ حالات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ صدیقی صاحب نے میرے طرز استدلال کو تو "بالکل وہی" بنایا ہے جو "غیر مسلم مستشرقین اور مسلمان مستغربین" اختیار کرتے ہیں (صفحہ ۲۴۳)،

اس بیے ایسے لوگوں کا ذکر تو بیکار ہے۔ اُن اصحاب کے متعلق مولانا صاحب کے ارشادات سُنیے جو گرا ہوں کی راہبری کا دعوٰے کرتے ہیں۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"پہلے مدت ہائے دراز تک ہمارے ہاں تہذیب و تمدن کا ارتقاء اور علوم و فنون کا نشوونما معطل رہا۔ (نوٹ، اس وقت نہ وہ مستشرقین تھے اور نہ وہ مستغربین جن کو صدیقی صاحب ہر بُرائی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں)۔ پھر جمود کے نتیجے میں ہم پر سیاسی زوال آیا۔ اور دنیا کی مسلمان قومیں یا تو براہِ راست غیر مسلم حکومتوں کی غلام ہو گئیں یا ان میں سے بعض کو کچھ آزادی حاصل بھی رہی تو وہ غلامی سے کچھ کم نہ تھی کیونکہ شکست خوردگی کا اثر ان کے قلب و رُوح کی گہرائیوں تک اُتر چکا تھا۔ آخر جب ہم نے اُٹھنا چاہا تو ہر جگہ کے مسلمانوں کو، خواہ وہ غلام تھے یا آزاد، اُٹھنے کی ایک ہی صورت نظر آئی اور وہ یہ تھی کہ جدید تہذیب و تمدن اور جدید علوم کا سہارا لے کر اُٹھیں۔ ہمارے دینی علوم کے حامل جو طبقے تھے وہ خود اسی انحطاط میں مبتلا تھے جس میں ساری اُمت مبتلا تھی۔ مذہبی بنیادوں پر کوئی زندگی بخش اور انقلاب انگیز حرکت برپا کرنا ان کے بس کا کام نہ تھا۔ اُن کی رہنمائی سے مایوس ہو کر اُمت کے بے چین طبقے دنیا کے اُس نظامِ زندگی کی طرف متوجہ ہو گئے جو صریحاً کامیاب نظر آرہا تھا۔" (تقریر مورخہ ۶ جنوری ۱۹۴۸ء)

یہ حالت قدیم زمانے کی نہیں بلکہ بموجب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب آج بھی یہی کیفیت ہے۔ چنانچہ مولانا صاحب اُسی تقریر میں فرماتے ہیں کہ:۔

"حاملانِ دین کی رہنمائی میں دینی تعلیم کا جو نظام چل رہا ہے وہ اِس وقت تک بیسویں صدی کے لیے بارھویں صدی کے مردان کار تیار کرنے میں مشغول ہے۔ اس لیے کوئی ایسا گروہ بھی موجود نہیں جو شاگردانِ مغرب کو ہٹا کر اسلامی قانون کے مطابق ایک جدید ریاست کا نظام بنائے اور چلا سکے۔"

علماء دیوبند اور بریلی اِس سے اتفاق نہیں کریں گے۔ مگر اِن الفاظ میں مولانا صاحب نے "مغرب زدہ" طبقے کو معاف فرما کر ذمہ داری ان پر رکھی ہے جن کو صدیقی صاحب نے "رجعت پسند" (فروری ص ۲۸۵) کا خطاب دیا ہے۔ جدید طرز کے خیالات والوں کے متعلق مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"اصل مشکل صرف یہ ہے کہ وہ دماغ (جدید تعلیم یافتہ حضرات کا) جن کی فکر و محنت اس کے لیے

درکار ہے۔ (نوٹ۔ مولانا صاحب کو اس ضرورت کا احساس ہے) بجائے خود مطمئن نہیں ہیں۔ اور ان کے عدم اطمینان کی وجہ ان کی عدم واقفیت ہے۔ اس لیے سب سے پہلے جو کام کرنے کا ہے وہ یہی ہے کہ انہیں واضح طریقہ پر یہ بتایا جائے کہ اسلامی قانون کس چیز کا نام ہے، اس کی حقیقت کیا ہے۔"

(تقریر مورخہ ۶ جنوری ۱۹۴۸ء)

اب اگر میں نے اہل علم کی توجہ اس طرف دلانی چاہی تو کم از کم صدیقی صاحب تو ٹھنڈے دل سے غور فرماتے۔ مگر وہ اس کو "چوٹ" (صفحہ ۲۸۵) فرماتے ہیں۔ اور اپنی طرف سے اس پر نمک مرچ چھڑک کر اس کی کسک کو پڑھنے والوں تک پہنچا دینا چاہتے ہیں۔ وہ تو الزام تراشیاں کر کے اپنا حق ادا کر چکے۔

کیا قرآن پاک میں وسعت نہیں ہے اور اگر ہے تو کیا یہ خطرناک چیز ہے؟

صدیقی صاحب فروری کی اشاعت کے صفحہ نمبر ۲۴۳ پر فرماتے ہیں کہ:۔

"صاحب مقالہ نے اپنی گفتگو کے آغاز میں ہمیں یہ مژدۂ جانفزا بھی سنا دیا کہ شام ہمدرد کی محفلیں سجانے والے حکیم محمد سعید صاحب اس طرح کے دیگر عنوانات کے تحت ذی علم حضرات کو مقالات پیش کرنے کی دعوت دے رہے ہیں جن میں اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا ہے کہ جو بات بھی کہی جائے "وہ خالص قرآنی نقطۂ نظر" سے کی جائے۔ ہم اس فاضلانہ مقالے کے مندرجات پر کوئی تبصرہ کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلم قوم کے اندر یہ رجحان ہی بڑا خطرناک ہے کہ اس کے اہلِ علم سنت سے بے نیاز ہو کر صرف قرآن کی روشنی میں اپنے مسائل حل کریں۔"

حالانکہ یہ مسئلہ نہ حکیم محمد سعید صاحب نے چھیڑا تھا اور نہ میں نے کہ قرآنِ پاک لے لو اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دو۔ بس قرآن پاک کا نام لینا ہی خطرہ کا نشان بن گیا اور اس کو ایک سازش تصور کرنا بھی ضروری ہو گیا ہے۔ چنانچہ مئی کی اشاعت میں صفحہ ۱۰۱ پر صدیقی صاحب یوں رقمطراز ہیں کہ:۔

"اہلِ مغرب نے مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے علمی سطح پر جو سازشیں کی ہیں ان میں سے ایک نہایت ہی خطرناک سازش یہ ہے کہ اسلامی اصطلاحات اور دینی تصورات میں بظاہر اتنی وسعت پیدا کر دی جائے جس سے اسلام کی ہمہ گیری میں اضافہ ہو اور جس میں انسان کھو کر دینِ حق سے لاشعوری طور پر دور ہوتا چلا جائے۔"

مذکورہ بالا پرچے کے صفحہ ۱۱۱ پر منکرینِ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ وہ لوگ

یہ کہتے ہیں کہ قرآن کا پیغام ابدی اور آفاقی ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دعوت کو پورا کرنے کے لیے "جو ادارے جس انداز اور صورت میں" قائم کیے، ان پر چونکہ وقت کی چھاپ تھی" اس لیے وہ اسلام کے سرمدی پیغام کے ترجمان نہیں ہو سکتے"۔

منکرینِ سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کہا ہو وہ جانیں۔ مگر حکیم محمد سعید صاحب نے اور میں نے تو سنتِ رسول اللہ کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اس لیے یہ الزام ہم پر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ کیا قرآن پاک کا پیغام ابدی، آفاقی، سرمدی اور ہمہ گیر نہیں ہے؟ اور اگر ہے تو کیا "خالص" قرآن کے نقطۂ نظر کا مطالعہ واقعی خطرناک ہے؟ اور کلام پاک کی طرف توجہ کرنا ایک سازش ہے؟

میرا تو یہ ایمان ہے کہ کلام اللہ ابدی، آفاقی، سرمدی اور ہمہ گیر پیغام ہے جو زمان و مکان سے ماورا، ہر زمانے، ہر قوم وملت اور ہر سرزمین کے لیے بھیجا گیا ہے۔ یہ تو اسلام کی خوبی اور کلام اللہ کی بڑی اعلیٰ صفات ہیں۔ کلامِ پاک اور اس کے تصورات میں اتنی وسعت ہے کہ اس سے زیادہ تصور نہیں کی جا سکتی اور کوئی انسان تصور نہیں کر سکتا کہ اس کی وسعت میں اضافہ کر سکے، اہل مغرب کی کیا مجال ہے۔ اس کے برعکس کلام اللہ کی آفاقیت، ابدیت اور سرمدیت سے ڈرنا اور ان صفات کو سازش کہنا اس کی توقیر اور اعلیٰ مرتبت کا اقرار نہیں ہے۔ اسلام انسان کی تاریخ کے ارتقاء کا جو تصور دیتا ہے، ساری کائنات کے ایک قانون کے ماتحت ہونے کا جو راز بتاتا ہے، اس دنیا کے لیے بلکہ جہانوں کے لیے رحمت ہونے کا جو وعدہ کرتا ہے، آفاقی انصاف کا جو نظریہ دیتا ہے، جس طرح سزا اور جزا کو اعمال کا نتیجہ ظاہر کرتا ہے، دنیا کو دین سے اور بندے کو براہ راست خدا سے ملاتا ہے، تنگ نظری کو برا کہتا ہے، اِن خوبیوں کو بگاڑنے کے لیے سازش کی ضرورت ہے نہ کہ ان کو ماننے اور جاننے کے لیے۔

صدیقی صاحب کو ڈر یہ ہے کہ اگر انسان نے اسلام کی ہمہ گیری جان لی تو "لاشعوری طور پر دین برحق سے دور" ہو جائے گا۔ کون سے دین سے؟ اسی دین سے جو آفاقی، ابدی، سرمدی اور ہمہ گیر ہے؟ اس سے تو وہ قریب تر ہو گا۔ البتہ فرقہ بندیوں اور روز کی تکرار سے دُور ہو جائے گا۔ جس طرزِ خیال نے یہ خیال کیا ہے کہ صحیح بخاری، جس کو آج کلامِ پاک کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب کہتے ہیں، اس کے مرتب امام بخاریؒ کی زندگی میں ان کو اتنا تنگ کیا گیا کہ انہوں نے مرنے کی آرزو کی۔ آج امام ابوحنیفہؒ کے فتووں کو اعتقادات کا درجہ دیتے ہیں۔ مگر ان کی زندگی میں ان پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا۔ اگر اسلام کی آفاقیت اور ہمہ گیری کو جانتے اور

ماننے تو مولانا حالیؒ، مولانا شبلیؒ، ڈاکٹر اقبالؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پر کفر کے فتوے نہ لگتے۔ دلوں میں اختلاف کی سمائی ہوئی اتنی وسعت ہوتی کہ دوسروں کی نیک نیتی کو تسلیم کریں۔ بس کسی کی ایک آدھ بات اپنے خیال کے خلاف ملی اور اس کی عزت کو مٹا دینے کے درپے ہوگئے اور کافر بنا کر کافر گر خوش ہوئے کہ ہماری پارٹی کی فتح ہوگئی۔ اگر ہم خیال بنا کر مسلمان نہ کیا تو کیا ہوا۔ کافر تو بنا کر چھوڑا۔ جو داغ ہم نے لگایا ہے اُس کی بُو آنے والی نسلوں کی ناک میں تو جائے گی۔ اُدھر یہ ہوا کہ لفظ کفر سے نفرت کی بُو دُور ہوتی چلی گئی۔ اور لاکھوں مسلمانوں نے اُن ہی "کافروں" کی عزت بھی کی اور ان کو مظلوم بھی جانا۔ اب ان اختلافات کا فیصلہ روزِ حساب میں اللہ کے سامنے ہوگا۔ کیونکہ ایسے اختلافات کا فیصلہ اس نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے۔ (المائدہ ۵ : ۴۸)

اہلِ اسلام کو فرقوں اور جماعتوں میں تقسیم کرنا آسان ہے۔ کیونکہ اس میں فرقہ پرستی اور گروہ بندی کے جذبات کو تسکین ہوتی ہے۔ اور یہ بھی آسان ہے کہ ہر فرقہ اور ہر جماعت حق پر ہونے کی دعویدار بن جائے اور اس زعم پر مطمئن رہے کہ وہی اکیلا حق پر ہے۔ اس حالت میں کلام پاک کی اِن آیاتِ کریمہ کو یاد رکھنا چاہیے کہ:۔

"(پس اے نبیؐ اور نبی کے پیرو) یک سُو ہو کر اپنا رُخ اِس دین کی سمت میں جما دو۔ قائم ہو جاؤ اُس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی۔ یہی بالکل راست اور درست دین ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ (قائم ہو جاؤ اس بات پر) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے اور ڈرو اس سے اور نماز قائم کرو۔ اور نہ ہو جاؤ ان مشرکوں میں سے جنہوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا ہے۔ اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ہر ایک گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی پر وہ مگن ہے۔ (روم ۳۰ : ۳۰ ، ۳۱) تفہیم القرآن۔

یہ حکم بموجب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے نبی کے لیے بھی تھا اور ان کے پیرووں کے لیے بھی ہے۔ ذرا 'فطرت' کے لفظ پر غور کیجیے، ساخت کی ابدیت پر غور کیجیے۔ اس پر بھی غور کیجیے کہ دین کو بانٹنے والوں کی مثال مشرکوں سے دی گئی ہے۔ اور اس پر غور کیجیے کہ ہر ایک گروہ یہ سمجھ کر مگن رہتا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہی سب کچھ ہے۔ یہ اعلان قرآن پاک کی ہمہ گیری، آفاقیت، سرمدیت اور ابدیت نہیں تو اور کیا ہے؟

شاید صدیقی صاحب کو یہ ڈر بھی ہے کہ اگر اِن اعلیٰ اوصاف کا اظہار کیا گیا تو لوگ سنّتِ رسولؐ اللہ کو چھوڑ دیں گے، کیونکہ منکرینِ سنّت یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ کی ساری حیاتِ طیبہ پر زمان و مکان کی چھاپ ہے۔

مگر اس خیال سے تو وہ لوگ ڈریں جن کو یہ اعتراض صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیا رسولِ برحق اور محبوب خدا کی زندگی قرآنی زندگی نہ تھی؟ اگر ہم یہ مانتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، اعمال اور تقاریر کی ابدیت ظاہر کریں جیسے کہ وہ درحقیقت ہیں۔ اس خیال کا جواب یہ تو نہیں ہے کہ قرآن پاک اور اسلام کی ابدیت، آفاقیت، ہمہ گیری اور سرمدیت کہ اس کو سازش کہیں اور اس کو چھپانے کی کوشش میں لگ جائیں۔ یہ باتیں چھپانے سے چھپتی ہیں؟ یا اس کاٹ چھانٹ سے فنا ہوتی ہے؟

ممکن ہے صدیقی صاحب اس سے ڈرتے ہوں کہ سب لوگ کلام پاک پڑھیں گے تو معلوم نہیں کیا سمجھ بیٹھیں۔ یہ ڈر عیسائیوں کے روم کے پاپائے اعظم کو بھی لاحق ہے۔ انہوں نے بھی صدیوں انجیل کے مطالعہ سے منع فرمایا تھا۔ کیونکہ وہ بھی یہ ڈرتے رہے ہیں کہ کہیں میرے پیرو وہ بات نہ پڑھ لیں جس کو میں نہیں مانتا۔ صحیح بات تو بس وہی ہے جو میں کہہ دوں۔ مگر اسلام میں تو کوئی اس طرح کے پاپائے اعظم موجود نہیں ہیں۔ یہاں یہ ڈر کیوں لاحق ہو؟ یہاں تو کام افہام وتفہیم، خلوص اور دین کی محبت سے چلتا ہے۔ یہ درست ہے کہ کلامِ پاک کو سمجھنے کے لیے علم دین چاہیے۔ مگر ہاں دنیا کی خبر بھی ہونی چاہیے، جو اس کے مسائل ہیں ان کا بھی علم اور تجربہ ہونا چاہیے۔ جتنی خبر ان باتوں کی ہوگی اتنی ہی قدر بنیادی اصولوں کی ہوگی۔ کیونکہ بنیادی اصول سب جزویات پر حاوی ہوتے ہیں۔ اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تقاریر سے اصول نکالنے میں آسانی ہوگی۔

(باقی)

(بقیہ اتمامِ نعمت)

اس حدیث میں اس بات کا قطعی ثبوت موجود ہے کہ شریعت نے ہر طریقۂ عمل کی وضاحت کر دی ہے۔ اب بنی نوع انسان کے لیے دو ہی ممکن راستے ہیں یا تو وہ طریقہ اختیار کریں جو شریعت نے بتلایا ہے یا اس کے علاوہ کسی دوسرے طریقے پر عمل پیرا ہوں۔ لیکن دوسری صورت میں یہ ضرور لازم آئے گا کہ انہوں نے سنّت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ تصور کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی فعل اب بھی ممکن ہے جس کے بارے میں کتاب وسنّت خاموش ہو۔

(باقی)

مطبوعات

ابوالغریب مصنف جناب قمرالدین احمد صاحب صفحات : ۲۶۷ کاغذ اخباری

حصہ اول طباعت معمولی - ملنے کا پتہ جاپانا ہاؤس - میٹھادر چوک کراچی ۲ قیمت : ۷/- روپے

جناب قمرالدین احمد صاحب کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں - ان کا نام علمی دنیا میں اب غیر معروف نہیں رہا ہے - وہ ایک درجن کتابوں کے مولف ہیں جو اہل علم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں - زیر نظر کتاب انہی کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے -

زیرِ تبصرہ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے جن کے عنوان ہیں (۱) سات قیامتیں (۲) تثلیث کے سپوت (۳) ساختۂ انگلستان (۴) عالمی سازشیں - اس کے علاوہ کتاب کے آخر میں چار ضمیمے ہیں جن میں ضمیمہ ۲ بعنوان "یہودیوں اور قادیانیوں کی سازش" اہم ہے -

کتاب مسلمانوں کے خلاف ہنود و یہود اور اہلِ تثلیث کے بغض و عناد اور ان کی اسلام دشمنی کو بے نقاب کرتی ہے مختلف تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہندو، یہودی اور نصرانی اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود اسلام دشمنی میں ہم مشرب اور ہم رکاب ہیں صلیبی جنگیں ہوں یا چنگیز و ہلاکو خاں کی تاخت و تاراج، امیر تیمور کا حملہ ہو یا ترکوں کے خلاف اہلِ فرنگ کی سازشیں، اندلس میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہو یا اسلام کے خلاف عصرِ حاضر کی صیہونی و نصرانی (روسی و امریکی) قوتوں کی ریشہ دوانیاں، ان سب کے پیچھے یہود و نصاریٰ اور ہندو سامراج کا ہاتھ رہا ہے -

فاضل مؤلف نے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ آج جس قوم کو دنیا "ہندو" کے نام سے جانتی ہے اس کا وجود فرنگی سازش کا مرہونِ منت ہے - خود انگریز مؤرخین کے مستند حوالوں سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ ہندو کسی قوم، مذہب یا نسل کا نام نہیں اور سنسکرت جو ہندوؤں کی مادری اور مذہبی زبان کہلاتی ہے اس کا ذکر کسی لغت کی کتاب میں نہیں ملتا - حتیٰ کہ مسٹر نرادسی چوہدری اور بنکم چندر جیسے ہندو دانشور بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ ہندو کو بطور ایک قوم کے انگریزوں نے متعارف کرایا اور اسی سفید فام قوم کے اہلِ فن نے سنسکرت کا رسم الخط ایجاد کیا اور اسے ترقی دی - ہندو قوم کو متعارف کرانے اور سنسکرت کو فروغ دینے میں اہلِ فرنگ کی اس غیر معمولی دلچسپی کی وجہ صرف یہ تھی کہ اُمتِ مسلمہ کے مقابلے میں ایک نئی قوم کو کھڑا کیا جائے، اور مسلمانوں کی زبان، جو اس کی درخشاں تہذیب کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، کے مقابلے میں سنسکرت کو اہم زبان کی حیثیت دی جائے تاکہ ملتِ اسلامیہ احساسِ کہتری کا شکار ہو کر رہ جائے -

مصنف کا خیال ہے کہ اگر یہود و نصاریٰ اور ہندو سامراج کے اصل اور بھیانک چہرہ کو اس طرح بے نقاب کیا جائے گا تو پھر انہیں اسلام، پیغمبرِ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہرزہ سرائی کی جرأت نہیں ہوگی بلکہ یہ قومیں اپنے مکروہ

(بقیہ اشارات) نیکی کو فروغ نصیب ہوا، شرافت کا وقار بڑھا۔ لیکن دنیا کی یہ مقدس امانت ہمارے سپرد ہوئی تو ہماری غفلتوں اور کوتاہیوں بلکہ مجرمانہ کارروائیوں سے اللہ کا دین رسوا ہوا۔ اغیار ہمارے مذموم افعال اور زندگی کے بارے میں ہمارے غلط رویوں کو دیکھ کر اللہ کے دین سے ہی نفرت کرنے لگے۔ قیامت کے روز ہم رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آخر کس منہ سے جائیں گے؟ یہ احساس ہمارے لیے سب سے زیادہ پریشان کن ہے۔

(بقیہ مطبوعات)

چھپانے کی کوشش کریں گی۔ ہمارے خیال میں اس تدبیر سے مسلمانوں کے ذہنوں میں اپنے دشمنوں کے خلاف ایک منفی ردعمل تو پیدا ہو سکتا ہے لیکن وہ بنیاد جس پر کسی مثبت فکر کی تشکیل ہوتی ہے وہ فراہم نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ اندازِ دفاع صرف "جواب آں غزل" ہی کا مصداق ٹھہرے گا جو سنجیدہ حلقوں میں مشکل ہی سے پذیرائی حاصل کر سکتا ہے۔

مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی غیر مسلم قوموں خصوصاً یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کو کبھی اپنا غمگسار اور ہمدرد نہیں سمجھا ہے بلکہ ان کا عقیدہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ الکفر ملۃ واحدۃ۔ پھر اس دور کی یہودیت و نصرانیت کا گٹھ جوڑ بھی کوئی نیا نہیں ہے۔ مدینہ کے یہودی ہوں یا رُوم کے عیسائی یا ایران کے آتش پرست، یہ ہمیشہ ملتِ اسلامیہ کی پیش رفت کو روکنے میں اتحاد و اشتراک کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اسلام کا بڑھتا ہوا کاروان رو سکے نہ رُک سکا۔ اس کی محض وجہ یہ تھی کہ اسلام زندہ تھا اور مسلمانوں کی روح میں پوری طرح سرایت کیے ہوئے تھا۔ ہماری رائے میں اگر فاضل مصنف ان اسباب کا تجزیہ بھی پیش کرتے جن کی وجہ سے مسلمانوں کی صفوں میں انتشار، ان کے عزائم میں ضعف و تزلزل اور ان کے جذبۂ جہاد میں جمود پیدا ہوا اور وہ پے در پے اغیار کی سازشوں کا شکار ہوتے رہے تو اس سے ملتِ اسلامیہ کی تعمیرِ نو کا نقشہ تیار کرنے میں بھی قاری کو کافی مدد ملتی اور تلافیٔ مافات کی آرزو بھی پیدا ہوتی۔

بہرحال کتاب موجودہ صورت میں بھی معلومات افزا ہے۔ اس کا مطالعہ خاص طور پر نوجوان نسل کے لیے کارآمد ثابت ہوگا جس کو ہندو ذہن کی عیاری سے سابقہ پیش نہیں آیا ہے۔ کتاب کی طباعت و کتابت اچھی نہیں ہے علمی کتابوں کے لیے طباعت بھی ان کے شایانِ شان ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ کتاب کا نام بھی کچھ موزوں نہیں ہے "ابوالغریب" کے نام سے ذہن ناول کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

معذرت

پریس میں طباعت کی تاخیر کی وجہ سے ترجمۂ قرآن مجید مارچ کے پہلے ہفتہ میں شائقین حضرات کی خدمت میں پیش نہیں کیا جا سکے گا۔

انشاء اللہ العزیز ماہ اپریل میں آرڈر کی تعمیل کی جائے گی۔

ناظم

ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ ۔ لاہور